خوابِ حقیقت
وحشی سعید

خواب حقیقت

(افسانے)

وحشی سعید

زیر اہتمام

تحریک ادب

Vehshi Syed

Khwab Haqeeqat

(Short Stories)

نام کتاب: خواب حقیقت

افسانہ نگار: وحشی سعید

سرورق: عظمیٰ اسکرین

ضخامت: ۱۲۰ صفحات

طباعت: مہاویر پریس، وارانسی

کمپوزنگ: عظمیٰ اسکرین، وارانسی Mob.: 9369138837

e-mail: uzmascreen@gmail.com

سن اشاعت: جون ۲۰۱۴ء

تعداد: ۵۰۰

قیمت: ۲۰۰/روپئے

تقسیم کار:

☆ Tahreek-e-Adab, Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata

Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 U.P.

Cell: 09935957330

☆ M. Syed Tramboo (Vehshi Syed)

Hotel Shahenshah Palace, Boulevard Road, Dal Gate

Srinagar-190001 (J&K)

Cell: 09419012800

ترتیب

ب آئے گا وہ سقراط

ہیں وہاں کا ...ہنے والا ہوں جہاں سر سبز وادیاں ہیں، صاف شفاف پانی کی بے شمار جھیلیں ہیں۔ رنگ ...رنگ کے پھولوں کے لاتعداد باغیچے ہیں، میٹھے پانی کے بہتے ہوئے جھرنے ہیں۔ ہزاروں پرندے چرندے ہیں، گاتی ہوئی بلبلیں ہیں، اڑان بھرتے ہوئے خوبصورت کبوتر ہیں۔ وہاں لوگ دن کو چراغ جلاتے ہیں اور رات کو سورج اگاتے ہیں۔ مرگ کو حیات اور حیات کو مرگ کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ شہر جو اونچی اونچی پہاڑیوں کے گھیرے میں ہے۔ ایک پہاڑی کوہ ماراں کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے شہر میں ایک مسخرہ شیخ چلی بھی رہتا تھا۔ وہ دن بھر شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتا۔ بچوں، بوڑھوں، جوانوں، عورتوں کو سنہرے خواب بیچتا۔ ریت کے محل بناتا۔ شہر کے سادہ لوح لوگ اس کی باتوں پر ایسا یقین کرتے تھے جیسے فرمان۔ اس مسخرے کی باتوں میں وہ اپنا روشن مستقبل ڈھونڈتے۔

شیخ چلی آفتاب طلوع ہونے کے انتظار میں رہتا۔ رات کو وہ کوہ ماران پہنچ جاتا۔ اس یقین کے ساتھ کہ کوہ ماران رات کو سونے کا بن جائے گا۔ جیسے جیسے رات گزرتی جاتی اس پر نیند کا غلبہ بڑھتا جاتا۔ اس کی آنکھ تب کھلتی جب سورج سر پر آجاتا۔

یہ عمل شیخ چلی کے ساتھ روز پیش آتا اور وہ شہر والوں کو خواب بیچنے نکل پڑتا۔ میرے شہر میں ایک دن چانکیہ وارد ہوا۔ وہی چانکیہ جس نے زمانہ قدیم میں چندر گپت کو تخت پر بٹھایا۔ تب سے اب تک تاریخ کے صفحوں سے نکل کر چانکیہ نے کئی جنم لیے، کئی رنگ روپ بدلے۔ اس کے میرے شہر میں گھومنے کی وجہ کسی ایسے آدمی کو گلے لگانے کی تھی جو مسخرہ ہو۔ اس

کب آئے گا وہ سقراط

میں وہاں کا رہنے والا ہوں جہاں سرسبز وادیاں ہیں، صاف شفاف پانی کی بے شمار جھیلیں ہیں۔ رنگ برنگ کے پھولوں کے لاتعداد باغیچے ہیں، میٹھے پانی کے بہتے ہوئے جھرنے ہیں۔ ہزاروں پرندے چرندے ہیں، گاتی ہوئی بلبلیں ہیں، اڑان بھرتے ہوئے خوبصورت کبوتر ہیں۔ وہاں لوگ دن کو چراغ جلاتے ہیں اور رات کو سورج اگاتے ہیں۔ مرگ کو حیات اور حیات کو مرگ کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ شہر جو اونچی اونچی پہاڑیوں کے گھیرے میں ہے۔ ایک پہاڑی کوہ ماراں کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے شہر میں ایک مسخرہ شیخ چلی بھی رہتا تھا۔ وہ دن بھر شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتا۔ بچوں، بوڑھوں، جوانوں، عورتوں کو سنہرے خواب بیچتا۔ ریت کے محل بناتا۔ شہر کے سادہ لوح لوگ اس کی باتوں پر ایسا یقین کرتے تھے جیسے فرمان۔ اس مسخرے کی باتوں میں وہ اپنا روشن مستقبل ڈھونڈتے۔

شیخ چلی آفتاب طلوع ہونے کے انتظار میں رہتا۔ رات کو وہ کوہ ماران پہنچ جاتا۔ اس یقین کے ساتھ کہ کوہ ماران رات کو سونے کا بن جائے گا۔ جیسے جیسے رات گزرتی جاتی اس پر نیند کا غلبہ بڑھتا جاتا۔ اس کی آنکھ تب کھلتی جب سورج سر پر آجاتا۔

یہ عمل شیخ چلی کے ساتھ روز پیش آتا اور وہ شہر والوں کو خواب بیچنے نکل پڑتا۔ میرے شہر میں ایک دن چانکیہ وارد ہوا۔ وہی چانکیہ جس نے زمانہ قدیم میں چندر گپت کو تخت پر بٹھایا۔ تب سے اب تک تاریخ کے صفحوں سے نکل کر چانکیہ نے کئی جنم لیے، کئی رنگ روپ بدلے۔ اس کے میرے شہر میں گھومنے کی وجہ کسی ایسے آدمی کو گلے لگانے کی تھی جو مسخرہ ہو۔ اس

نے جب شیخ چلی کو لوگوں کو خواب بیچتے دیکھا تو رک گیا اور خود سے کہا۔

''یہی تو ہے وہ...!''

پاس کھڑے اجنبی نے کہا۔

''یہ ایک مسخرہ ہے۔ جس کے جھانسے میں لوگ آتے ہیں۔''

چانکیہ نے کہا۔

''میں اس دلچسپ شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اجنبی نے چانیہ سے کہا۔

''یہ ایک مسخرہ ہے۔''

چانکیہ بولا۔

''عقلمند آدمی میرے کس کام کا؟ شیخ چلی سے کہاں ملاقات ہوگی؟''

اجنبی بولا۔

''شیخ چلی کا ٹھکانہ کوہ ماران کا دامن ہے۔

چانکیہ رات کے اندھیرے میں کوہ ماراں پہنچ گیا۔

''میں تم سے ملنے آیا ہوں؟''

''مجھ سے۔ کیوں؟ تم کون ہو؟''

''میں چانکیہ ہوں، اور تاریخ کے صفحوں سے نکل کر تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔''

شیخ چلی نے کوہ ماراں کی جانب اشارہ کیا۔

''کیا تم نے اس پتھریلے پہاڑ کو کبھی سونے کا ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟''

چانکیہ بولا۔

''میں جس چیز کو چھولوں وہ سونا بن جاتا ہے۔ مجھ سے ہاتھ ملاؤ گے تو تم بھی سونے کے بن جاؤ گے۔''

شیخ چلی دوڑتے ہوئے چانکیہ سے بغلگیر ہوا۔

''چانکیہ مجھے تمہاری تلاش تھی۔''

نہ جانے آسمان اس لمحے کیوں رونے لگا۔

چانکیہ تاریخ کا ایک شاطر کھلاڑی تھا۔ اس نے سلیوکس کو دھول چٹائی تھی۔ چندر گپت کو تاریخ کا ایک بے مثال راجہ بنایا تھا۔

وہ شیخ چلی کے خوابوں کی تعبیر بتانے لگا۔

اپنی تعبیر کو سن کر شیخ چلی ناچنے لگا۔

چانکیہ [illegible] کا اور شیخ چلی آج کا سلطان تھا۔ اس خوشی میں شیخ چلی نے جشن کا اہتمام کیا جس میں مرد عورتوں کے کپڑے پہن کر ناچنے لگے۔ جشن کا انوکھا ماحول تھا، لوگوں کی بڑی تعداد اس ماحول میں ایسی رنگی کہ مسخرے کو سچ مچ سلطان سمجھنے لگی۔

شیخ چلی اپنا ہر کام چانکیہ کے آشیرواد سے کرتا تھا۔ جلد ہی میرے شہر کے لوگوں کے لیے مسخرے کی غلامی ذلت بن گئی۔ شیخ چلی خوابوں کا سوداگر تھا اور خواب خواب ہوتے ہیں۔ اس نے ایک صبح خود کو اکیلا پایا۔ وہ تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔

چانکیہ کے کارندوں نے چانکیہ سے کہا۔

"آپ نے ایسے مسخرے کو اپنا دوست کیسے بنایا جس کو آپ کی تاریخی حیثیت کا اندازہ نہیں ہے۔"

"اے مسخرے بتاؤ ان کی حیثیت کیا ہے؟"

شیخ چلی خاموش رہا۔

چانکیہ بولا۔

"چندر گپت کو راجہ بنایا۔ مسخرہ ایک ایسی چیز ہے جس کو استعمال کر کے پھینک دیا جاتا ہے۔"

کارندوں کو اشارہ ملنے کی دیر تھی۔ انہوں نے رات کے اندھیرے میں کالا لباس زیب تن کیا۔ شیخ چلی کو گرفتار کر کے زنداں میں ڈال دیا گیا۔

کیا کوہ ماران سونے کا ہو جائے گا یا یہ ہمارا تصور ہے۔

چانکیہ نے اپنے کارندوں سے کہا، غلام کو اقتدار سونپ دو، وہ ہماری شہنشاہی کے

بوجھ تلے دب جائے گا۔

غلام بولا۔

"وادی کے پہاڑ سونے کے بنادوں گا اور چاندی کی نہریں بہادوں گا۔ اتنی اونچی عمارتیں بنادوں گا کہ نظریں نہ پہنچ سکیں گی۔

کیا چانکیہ کیا چندر گپت، سب افسانوں میں تبدیل ہو گئے۔ غلام تاریخ کی سب سے بڑی حقیقت ہوگئی۔"

چانکیہ غلام کی باتوں پر بہت ہنسا۔ ایک دن چانکیہ نے غلام کو صفحۂ ہستی سے یوں مٹایا جیسے اس کا کوئی وجود نہ تھا۔

چانکیہ بیمار رہنے لگا۔ اور آخر کار تاریخ کے صفحوں میں واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے اپنی ذہنی وراثت اپنی بیٹی درگا کو سونپ دی۔ وہ وصیت کر گیا کہ شیخ چلی کو حاکم اعلیٰ بنانا۔

بیٹی نے پوچھا۔

"وہ کیوں؟"

"یہ تمہاری ذہانت کا پہلا امتحان ہوگا۔"

چانکیہ کی موت پر شیخ چلی بہت رویا۔ ایک بار پھر اس کے خواب ریت کے محل ثابت ہوئے اور وہ اب بھی اس غفلت میں مبتلا تھا کہ چانکیہ اس کا سچا دوست تھا۔ جبکہ اس کے لیے شیخ چلی شطرنج کا ایک معمولی پیادہ تھا۔

درگا نے شیخ چلی کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"چانکیہ کی یہ خواہش تھی کہ تم حاکم اعلیٰ بنو۔"

دوست واحباب نے شیخ چلی سے کہا۔

"آوارہ گردی بہت ہوئی۔"

درگا کے حکم سے شیخ چلی حاکم اعلیٰ بنا۔ لیکن وہ اب بھی خود کو سلطان سمجھتا تھا۔ ریت کا محل بنانے والا، پہاڑ کی چوٹی پر پانی چڑھانے کی تگ ودو کرنے لگا۔ وہ پھر خوابوں کی خرید و فروخت کرنے لگا۔ شہر کے راستوں سے گذرتا اور بگل بجا کر اپنے ہونے کا احساس دلاتا۔

اس نے اپنا ایمان، اپنا ضمیر درگا کے پاس گروی رکھ دیا۔ ایک دن ایسا آیا کہ شیخ چلی اس دنیا سے چلا گیا۔ درگا نے اس کا جسم رنگین کپڑوں میں لپیٹ دیا اور اپنے کارندوں سے کہا۔

"شیخ چلی تاریخ کے صفحوں میں ایسے دفن ہوگیا کہ اوہ افسانوں میں بھی نہ رہا۔"

یہ دوسری بات ہے کہ مجھ جیسا فرداب بھی اس سقراط کے انتظار میں ہے جس نے اپنی سچائی کو اپنا ایمان سمجھا جس نے زندگی اس لیے ٹھکرادی کہ وہ جھوٹ کی پرستش کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس نے زہر کا پیالہ مسکراتے ہوئے پی لیا۔

میں کوہ ماران کی پہاڑی کے دامن میں بیٹھا ہوا اس سقراط کے انتظار میں ہوں۔

کب آئے گا وہ سقراط!!

میرا قاتل میرا مسیحا

یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔

کمرے کے دائیں کونے میں ایک شیشہ کی الماری میں کچھ عربی، کچھ فارسی اور کچھ اردو کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کی چھت کے بیچوں بیچ ایک پرانے زمانے کا فانوس لٹک رہا تھا۔ فرش پر ایرانی قالین تھا، دائیں دیوار کے ساتھ قدیم زمانے کا ایک صوفہ سلیقے سے سجا تھا۔ چاندی جڑی ہوئی میز پر چاندی کی تھال میں مختلف اقسام کے پھل رکھے ہوئے تھے۔ بائیں دیوار پر قدیم زمانے کا عالیشان گھڑیال لٹک رہا تھا۔ جو ہر گھنٹے بعد بجتا اور وقت کا احساس کراتا۔ صوفے کے سامنے والی دیوار پر خوبصورت فریم میں قدنما آئینہ لگا تھا۔

یہ میرا ڈرائنگ روم تھا۔

ایک دن میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا کھڑکی سے ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کررہا تھا کہ اچانک میرے قدنما آئینہ سے ایک خوبصورت شخصیت میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔

''مجھے پہچانتے ہو۔''

میں گھبرا گیا، سٹپٹا گیا۔

''نہیں۔''

''تعجب ہے۔ تم مجھے نہیں پہچانتے۔''

میں نے اپنے اوسان پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''اچھا مذاق ہے۔''

وہ اب سنجیدہ ہوا۔

''[illegible] نے نہایت سلیقے سے الماری میں سجا کے رکھی ہیں ان ساری کتابوں میں میرا ذکر ہے۔''

کیا میں بوڑھا ہو گیا ہوں، کیا میری یادداشت جواب دے گئی ہے۔ وہ میرے ادراک کو للکار رہا تھا۔ میں اسے اپنی شیشے کی الماری میں رکھی ہوئی مختلف زبانوں کی مختلف کتابوں میں ڈھونڈتا رہا۔

سورج ڈوب گیا۔ رات ہوگئی۔

اور وہ شخص جو صوفے پر بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا، مجھے پریشان دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

صبح ہوگئی۔

رات بھر اس کو کتابوں میں ڈھونڈنے کے بعد بھی میری تلاش ناکام رہی۔

''اب تو بتاؤ کون ہو تم۔''

''کیا میں کتابوں میں نہیں ملا۔'' وہ ہنس پڑا۔

''چلو! اب فانوس میں مجھے ڈھونڈو۔''

میں بول پڑا۔

''تمہاری باتیں بھی عجیب معمہ ہیں۔ کیا مجھے پریشان کرنے میں تمہیں لطف آرہا ہے۔''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تم میری مٹھی میں ہو۔''

''ہوسکتا ہے تم صحیح کہہ رہے ہو۔''

''بہت اچھے! جس قالین پر تم کھڑے ہو اور اپنے بازو ہوا میں پھیلائے ہوئے ہو اس قالین کے مہین ڈیزائن میں..... میں رہتا ہوں۔''

میں نے قالین الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کوئی راستہ نہ ملا۔
میں تھکا ہارا صوفے پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بولا۔
''سامنے کی دیوار گھڑی کو غور سے دیکھو۔ وقت کا احساس دلانے والے [illegible] گھڑیال کی صدا میں مجھے ڈھونڈو۔''
میں چیخ پڑا۔
''معموں میں بات نہ کرو۔''
اس نے اطمینان سے کہا۔
''چیخنے سے کیا ہوگا۔ تم حقیقت سے کب تک بھاگتے رہو گے۔ تمہارے سامنے جو آئینہ ہے جس کے سامنے کھڑے ہو کر تم خود کو سنوارتے ہو۔ اپنی ہی تعریف میں قصیدے پڑھتے ہو۔ پہچانو..... مجھے پہچانو.....!!''
میرا ماتھا ٹھنکا۔
''میرے قریب ہو کر مجھ سے کتنے دور ہو۔''
اب وہ کھڑا ہوا۔ آئینہ کی طرف قدم بڑھائے۔
''اجازت۔''
میں اس کے سامنے کھڑا ہوا۔
''تم آخر ہو کون۔''
وہ دھیمی آواز میں بولا۔
''میں ہی تمہارا قاتل ہوں، میں ہی تمہارا مسیحا ہوں۔''
یہ کہتے ہی وہ آئینہ میں جذب ہو گیا۔

نجات دہندہ

بہت پرانی بات ہے۔ ایک ظالم حکمران اپنی رعایا کا وقت وقت پر قتل عام کرتا تھا۔ ان کے گھروں کو نذرِ آتش کرتا، بچوں کو نیزوں پر لٹکاتا۔ ہر طرف تباہی اور قتل و غارت کا بازار گرم کرتا۔ وہ ایسا اس لیے کرتا تھا کہ اس نے اپنے پرکھوں سے سن رکھا تھا کہ سلطنت پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنا ہو تو اپنی رعایا کو خوف و دہشت کے ماحول میں رکھو۔ اتنا بڑا جابر ہونے کے باوجود وہ ناگ راج سے خوف زدہ رہتا تھا۔ ناگ راج غار میں رہتا تھا، اس کو دن کی روشنی میں بہت کم دیکھا گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں، دن کی روشنی میں وہ تب دکھتا تھا جب وہ خوش ہوتا۔ حکمران کی مہارانی روز ناگ راج کی پوجا کرتی۔ حکمران جب بھی ناگ راج کے سامنے جاتا، سر جھکائے ہاتھ جوڑے دوزانو ہو کر بیٹھ جاتا اور بڑی ندامت سے کہتا۔

''ناگ راج مجھ پر اپنی کرپا بنائے رکھو۔''

ناگ راج پھنکارتے ہوئے کہتے۔

''تو اپنی رعایا پر کرپا بنائے رکھ۔''

''میں اپنے پرکھوں کے راستے پر چلتا ہوں۔''

''پھر بھیانک انجام کے لیے بھی تیار رہ۔''

ناگ راج کے غصہ کو کم کرنے کے لیے حکمران نے صدی کے بہترین سنگ تراشوں کو حکم دیا کہ ناگ راج کا بت تراشیں اور وہ بے مثال ہو۔ جب پانچ سوفٹ اونچا بت تیار ہوا، حکمران نے اپنی رعایا سے کہا۔

''میرے بعد اس بت کی پوجا کرنا۔''

بھیڑ میں سے ایک دلیر ضعیف بوڑھا کھڑا ہوا اور جابر حکمران سے کہا۔

''ہم اس پتھر کی مورتی کو اس دن خدا مان لیں گے جس دن تم جیسے جابر اور ظالم حکمران سے نجات ملے گی۔''

حکمران نے سپاہیوں سے کہا۔

''اس بوڑھے باغی کا سر قلم کردو۔''

بوڑھے نے سپاہی کے ہاتھ سے نیزہ چھین لیا اور حکمران کی طرف پھینک دیا۔ آناً فاناً بوڑھے کا نیزہ حکمران کے سینے کے آر پار ہو گیا۔

پہاڑ پر حکمران کا بیٹا اپنے استاد ارسطو سے تلوار بازی کے گر سیکھ رہا تھا۔ جب اس نے اپنے باپ کو زخمی ہوتے دیکھا تو اپنے گھوڑے کا رخ اپنے لہولہان باپ کی طرف کیا۔ ارسطو پکارتا رہا۔

''شہزادے لوگوں کے ہجوم کے سامنے جانا عقلمندی نہیں ہے۔''

شہزادے نے ارسطو کی بات ان سنی کر دی۔ وہ اپنے باپ کے لہولہان جسم کے ساتھ لپٹ گیا۔ دم توڑتے ہوئے باپ نے کہا۔

''یاد رکھنا شہزادے پرکھوں نے کہا تھا کامیاب حکمران وہی ہے جو جابر ہو۔''

حکمران نے دم توڑ دیا۔ ارسطو گھوڑا دوڑاتے ہوئے شہزادے کی طرف آ رہا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ نے شہزادے کو گھیرا اور اسے زخمی کر دیا۔ ارسطو شہزادے کی ڈھال بن گیا۔ اور اسے بھیڑ سے بچا کر محل کی طرف دوڑا۔ محل میں داخل ہوتے ہی اونچی اور لرزتی آواز میں تقریباً چیخ پڑا۔

''مہارانی حکمران مار ڈالا گیا اور شہزادہ زخمی ہے۔ بچالو، اپنے شہزادے کو بچالو۔''

مہارانی حکمران کی موت بھول گئی اور شہزادے کے زخمی جسم سے لپٹ گئی۔

''میرے بیٹے! میرے بیٹے!! میں تمہاری زندگی ناگ راج سے مانگ لوں گی۔''

ارسطو نے نئے حکمران کے زخمی جسم کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور مہارانی کے ساتھ غار میں داخل ہوا۔ مہارانی رو رہی تھی، سینہ پیٹ رہی تھی۔

''اٹھ ناگ راج اٹھ..... میرے دیوتا میرے بیٹے کو بچا لے۔ یاد ہے ایک دن آپ میرے رقص سے بہت خوش ہوئے تھے اور کہا تھا کہ زندگی میں ایک بار میں جو بھی مانگ لوں گی وہ مل جائے گا۔ آج وہ دن آ گیا۔ ناگ راج آج وہ دن آ گیا۔ آج میرے بیٹے کو امر زندگی کا دان دو۔ میرے [illegible] بیٹے کو امر زندگی دو۔''

ناگ راج نے اپنا پھن اٹھاتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔

''مہارانی میں اپنے وچن میں بندھا ہوا ہوں۔ لیکن تمہاری پرارتھنا تب سویکار کروں گا جب میری شرطیں تمہیں منظور ہوں گی۔''

مہارانی روتے ہوئے بول پڑی۔

''میرے دیوتا مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔''

ارسطو شہزادے کی حالت دیکھ کر چیخ پڑا۔

''ناگ راج شہزادہ دم توڑ رہا ہے۔''

ناگ راگ نرم آواز میں بولا۔

''تحمل..... تحمل .... پہلے شرائط سنو۔ ارسطو تم بھی سنو۔ تم بھی گواہ رہو۔ جب اسے دوبارہ زندگی ملے تو یہ نیا حکمران اپنے پرکھوں کی خونی تاریخ نہ دہرائے، انصاف سے کام لے۔ عدل کا بول بالا ہو، ہر طرف خوشحالی ہو۔ حکمران اپنی عوام کا چین وسکون حرام نہ کرے۔ مہارانی اگر وہ اپنے ظالم جابر باپ کا چولا پہن لے گا، اپنے پرکھوں کی تاریخ دہرائے گا تو تمہارے پاس ہماری دی ہوئی تلوار جواب تمہاری خاندانی تلوار کہلاتی ہے مجھے واپس کر دو گی۔ کیا تمہیں منظور ہے۔''

مہارانی نے دوزانو ہو کر کہا۔

''مجھے منظور ہے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ میرے بیٹے کو زندگی عطا کرو۔ میرے دیوتا میری التجا قبول کرو۔''

ناگ راج نے ارسطو کی طرف پھن گھماتے ہوئے کہا۔

''ارسطو تم اس نئے حکمران کی ہر حرکت پر کڑی نظر رکھنا اور مجھے خبر دیتے رہنا۔'' پھر

ناگ راج نے مہارانی سے کہا۔

"مہارانی میں اپنے دل کا ایک ٹکڑا تمہارے بیٹے کے دل میں ڈال رہا ہوں۔ وہ امر ہو جائے گا۔ جب تک ناگ راج ہے تب تک وہ ہے۔"

ناگ راج نے اپنے دل سے ایک ٹکڑا نکال کر نئے حکمران کے سینے میں ڈال دیا۔ اس کے مردہ جسم میں زندگی دوڑ گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ماں میں زندہ ہوں۔"

مہارانی نے اپنے بیٹے کو گلے لگایا۔ آناً فاناً سارے ملک میں یہ خبر پھیل گئی کہ نیا حکمران اپنے جاہ وجلال اور لشکر جرار کے ساتھ واپس آ رہا ہے۔

نیا حکمران جن راستوں سے گذرتا وہاں کے لوگ اپنا سینہ پیٹتے، اپنی آنے والی مصیبتوں کے خوفناک منظر کا تصور کرتے۔ اپنی قسمت کو کوستے۔ حکمران لوگوں کے ایک بڑے ہجوم سے مخاطب ہوا۔

"سنو غور سے سنو مجھے ناگ راج نے امر زندگی کا وردان دیا ہے۔ میں اپنی خاندانی تلوار سے دشمنوں سے اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔ میں قلعہ تعمیر کروں گا اور اندر کے دشمنوں کو کچل کے رکھ دوں گا۔

لوگ کانا پھوسی کرنے لگے۔

"اس ملک کا سب سے بڑا دشمن یہاں کا حکمران ہے۔ جس نے ہماری زندگی کو نرک بنا دیا ہے۔"

حکمران نے ارسطو سے کہا۔

"تم خود کو سب سے بڑا عقلمند کہتے ہو لیکن میرے سامنے تم بے وقوف ہو۔ میں اپنی دانشمندی سے پوری قوم کو اپنے شکنجے میں کس لوں گا۔ وہ میرے لیے شاندار محل اور قلعہ تعمیر کریں گے۔ میرے محل کو بناتے بناتے ان کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ میں مہارانی کا ناگ راج کو دیا ہوا وعدہ پورا کروں گا اور اپنے پرکھوں کی عظمت کی بھی لاج رکھوں گا۔

ارسطو نے نئے حکمران کے اس نئے روپ پر حقارت اور نفرت سے کہا۔

''تم مکاری کو عقلمندی کہتے ہو۔ تمہارا ظلم اور جبر بہت دنوں تک اس قوم کو دبا نہیں سکتا۔ انقلاب آئے گا اور تمہارا سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔''

نیا حکمران [illegible]

''[illegible] کا فرمان جاری کر دیتا لیکن تم میرے استاد ہو اس لیے تمہاری زندگی بخش [illegible]

ارسطو [illegible]

''[illegible] دیتا ہوں جب میں تمہارا استاد بنا۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ ختم۔''

حکمران [illegible] محل کی تعمیر میں مزدوری کے لیے ساری بستی سے فوج لوگوں کو اٹھا اٹھا کر لے جا [illegible] کیا ضعیف، کیا ناتواں، کیا بچے، کیا بوڑھے، کیا جواں، کیا عورتیں سب کے سب بیگار پر لگا دیئے گئے۔ جس کسی نے حکم عدولی کی اس کو تلوار کی نوک پر اچھالا گیا۔ جس ضعیف بوڑھے نے پرانے حکمران کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اس کے لیے حکم تھا کہ نہ کھانا دیا جائے نہ پانی۔ جب تک اس میں جان ہے تب تک اس سے مزدوری کرائی جائے۔ اس بوڑھے کی ایک جوان حسین بیٹی تھی۔ وہ بھی مزدوری کر رہی تھی اور بوڑھے باپ کا یہ حال دیکھ کر رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ جب اس سے باپ کا تڑپنا نہ سہا گیا تو حکمران کے سامنے دوزانو ہو کر دردناک آواز میں بول پڑی۔

''مجھے میرے باپ کو پانی پلانے کی اجازت دیجیے۔''

حکمران نے حسینہ کو دیکھ کر کہا۔

''حسینہ میں تمہارے حسن سے بہت متاثر ہوں۔ میں نہ صرف تمہیں پانی پلانے کی اجازت دیتا ہوں بلکہ اس کی آزادی کا حکم صادر کرتا ہوں۔ اپنے باپ کو پانی پلا دو۔''

حسینہ جب والد کی طرف پانی کا مٹکا لے کر دوڑی تو حکمران نے سپاہی کو اشارہ کیا۔ سپاہی نے بوڑھے کو موت کا جام پلا دیا۔ اپنے باپ کو مرتے دیکھ حسینہ کے ہاتھوں سے پانی کا مٹکا گر پڑا۔ وہ باپ کی لاش سے لپٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ آناً فاناً وہ حکمران کی طرف دوڑ پڑی اور اس کا گریباں پکڑ لیا۔

"قاتل......قاتل..."

حکمران نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔

"اس حسینہ کو میرے حرم میں پہنچادو۔"

سپاہیوں نے حسینہ کو حرم میں پہنچا دیا۔ وہاں کنیزوں نے اسے اپنے شکنجے میں لے لیا۔ روتی ہوئی حسینہ کو دولہن کی طرح سجایا اور حکمران کے کمرے میں پہنچا دیا۔

دور ارسطو یہ سارا ظلم دیکھ کر خون کے آنسو رو رہا تھا اور خود کو کوس رہا تھا کہ وہ اس کا استاد رہا تھا۔ ارسطو کا تحمل بھی جواب دے رہا تھا۔ وہ دوڑا دوڑا ناگ راج کے پاس گیا اور دو زانو بیٹھ کر بین بجانے لگا۔ اسے احساس نہ ہوا کہ کب تک بین بجاتا رہا۔ کئی دن بیت گئے۔ ناگ راج بھی بین سن کر مست ہو گیا اور بول پڑا۔

"کیا بات ہے ارسطو، بہت دنوں بعد مجھے بین سنائی۔ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو۔"

ارسطو بولا۔

"ناگ راج میں بہت دکھی ہوں، بہت اداس ہوں۔ میں نے ایک ایسے آدمی کو تلوار بازی سکھائی جو انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ آپ نے اس کو اپنے دل کا ٹکڑا دیا کہ وہ امر ہو گیا۔ اب اس کا اہنکار سر چڑھ کے بول رہا ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"

ناگ راج نے ارسطو سے کہا۔

"ارسطو گھبراؤ نہیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے کے بعد روشنی بہت دور نہیں ہوتی۔ نظر اٹھا اور میری نظر کے ساتھ دیکھ کون آ رہا ہے۔"

ایک خوبصورت معصوم لڑکی حکمران کے چنگل سے آزاد ہو کر بے تحاشہ جنگل کی طرف بھاگ رہی تھی۔ ناگ راج مسکرائے اور ارسطو کو ایک بازو میں اور حسینہ کو دوسرے بازو میں بھر لیا۔ ارسطو بول پڑا۔

"ناگ راج......تم دیوتا ہو۔"

ناگ راج مسکرائے۔

"ارسطو بین بجاؤ، حسینہ تم اپنے رقص سے مجھے مدہوش کرو۔"

ارسطو بین بجانے لگا اور حسینہ دلفریب رقص میں مگن ہوگئی۔ اچانک ناگ راج نے

ارسطو سے کہا۔

''رک جاؤ ارسطو.....کوئی آرہا ہے۔''

ارسطو بین رک گیا۔ مہارانی غار میں داخل ہوئی۔ دوزانو ہوکر ناگ راج کے

سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بیٹھ گئی۔

''ناگ راج مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ

میرا بیٹا ظالم اور جابر حکمران نہ بنے۔ میں اپنے وچن پر کھری نہیں اتری۔ ناگ راج حکمران

میرا بیٹا ہے۔ مجھے بتاؤ میرے دیوتا میں کیا کروں۔''

ناگ راج نے اپنی خونخوار آنکھوں سے مہارانی کی طرف دیکھا۔

''انصاف رشتوں کی بنیادوں پر نہیں ہوتا۔ تمہیں انصاف کرنا ہوگا۔ اپنی قوم کو جابر

اور ظالم حکمران سے نجات دلوانی ہوگی۔''

مہارانی نے روتے ہوئے کہا۔

''میرے بیٹے نے ایک شاندار محل بنایا، ایک قلعہ بنایا۔ باہر کی آفتوں سے اپنی قوم کو

محفوظ کیا۔''

ناگ راج دہاڑا۔

''اس نے محل اپنے آرام کے لیے بنایا، اس کا قلعہ اس کے ظلم اور طاقت کا مظاہرہ

کرتا ہے۔ مہارانی انصاف سے دغابازی نہ کرو۔''

''میرے بیٹے کی جان بخش دو۔''

''مہارانی تم نے اگر اپنا دیا ہوا وعدہ پورا نہ کیا تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔''

مہارانی ناگ راج کے غار سے بدحواس حالت میں نکلی اور اپنے بیٹے کے پاس جاکر

بولی۔

''میری خواہش تھی کہ تمہارے بعد اس ملک کا حکمران میرا پوتا ہو۔ لیکن میرا یہ خواب

خواب ہی رہے گا تم نے اپنی رعایا پر ظلم، قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ناگ راج

تمہارے خلاف ہے، وہ تمہاری موت میرے ہاتھوں سے چاہتا ہے۔ بتاؤ اب میں کیا کروں؟"

حکمران نے قہقہہ لگاتے ہوئے گا۔

"ماں کیوں گھبراتی ہو، ناگ راج کا دل میرے پاس ہے تم مجھے نہیں مار سکتی۔"

"لیکن ناگ راج تم سے اپنا دل واپس لے سکتا ہے۔ وہ دیوتا ہے۔ دیوتا کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"میں تمہارا بیٹا ہوں۔ ماں مجھے راستہ دکھاؤ تاکہ میں ناگ راج کو زیر کر سکوں۔"

مہارانی کچھ دیر گم سم کھڑی رہی۔ پھر بولی۔

"ہاں ہے راستہ۔ تم اپنے تمام وفادار سپیروں کو جمع کرو۔ وہ سب ایک ساتھ بین بجائیں۔ ناگ راج بینوں کے سروں میں مست ہو جائے گا اس کے بعد اسے قید کیا جا سکتا ہے۔ وہ تمہاری قید میں رہے گا اور تم ہمیشہ امر رہو گے۔"

حکمران خوشی سے اچھل پڑا۔

"ماں! تم اچھی ماں ہو۔"

مہارانی نے مایوس ہو کر کہا۔

"میں ایک کمزور ماں ہوں جس نے اپنے دیوتا کے ساتھ دغابازی کی۔"

حکمران نے حکم نامہ جاری کیا کہ تمام نامور سپیروں کو اس کے دربار میں پیش کیا جائے۔ آناً فاناً سپاہی ہر سمت دوڑے اور سپیروں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو کر حکمران کے سامنے پیش ہوئی۔

"تمہیں ناگ راج کو اپنی بین سنا کر اتنا بدمست کرنا ہوگا کہ ان کو قید کر لیا جائے۔ اس کامیابی کے عوض تم لوگوں کو انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔"

سپیروں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"جو حکم۔"

سپاہیوں نے ناگ راج کے غار کو گھیرے میں لیا۔ سپیرے ان کے دوش بدوش چل

رہے تھے۔ناگ راج نے ارسطو سے کہا۔

''ارسطو حکمران نے میری گرفتاری کے تمام اقدامات کر لیے۔فوج کا گھیرا توڑ کر حسینہ کو اپنے ساتھ لے کر نکل جاؤ۔''

''میں آپ کو چھوڑ کے کیسے جا سکتا ہوں میرے دیوتا۔''

ناگ راج نے کہا۔

''ارسطو یاد رکھو جنگ میں کچھ وقفے کے لیے پیچھے ہٹنا دانشمندی ہوتی ہے۔یہ جیت کی پہلی سیڑھی ہے۔''

ارسطو ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''جو حکم میرے دیوتا۔''

اس نے اپنی تلوار بازی سے فوج کا گھیرا توڑا اور حسینہ کو لے کر جنگل میں غائب ہو گیا۔

سپیروں نے بین بجانی شروع کی ناگ راج بین سنکر مست ہو گیا،فوج نے اسے لوہے کی زنجیروں میں قید کر لیا اور محل کے دیوان خاص میں لے آئے۔حکمران نے اعلان کیا۔

''ناگ راج ایک معمولی دیوتا ہے آج وہ میری قید میں ایک معمولی قیدی کی طرح پڑا ہے۔میں امر ہوں اور امر رہوں گا۔''

مہارانی جب دیوان خاص میں داخل ہوئی تو ناگ راج کو کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

''میرے دیوتا مجھے معلوم نہیں تھا مجھ سے اتنا بڑا جرم سرزد ہو گا۔اولاد کی محبت نے مجھے اندھا بنا دیا۔دیوتا! مجھے بتایئے میں کیسے اپنی غلطی کا ازالہ کر سکتی ہوں۔میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

''مہارانی! مجھے بہت اچھا لگا کہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔تمہاری غلطی کا ازالہ تب ہو سکتا ہے جب تم اپنی خاندانی تلوار اپنے خزانے سے نکال کر حسینہ کو سونپ دو۔''

مہارانی ناگ راج کا حکم سن کر سیدھے شاہی خزانے کی طرف دوڑ پڑی۔شاہی تلوار

نکال کر جنگل کی طرف گئی جہاں ارسطو اور حسینہ پہاڑوں کے پیچھے روپوش تھے۔

ارسطو نے مہارانی کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

''مہارانی!''

مہارانی نے کہا۔

''میں یہاں بہت دیر تک نہیں رک سکتی۔ ناگ راج نے مجھے حکم دیا کہ شاہی تلوار حسینہ کو سونپ دوں۔ ان کا حکم ہے کہ تم حسینہ اور تلوار لے کر محل میں آجاؤ اور ان کے سامنے پیش ہو۔''

''جو حکم دیوتا کا۔''

مہارانی جب محل میں داخل ہوئی تو حکمران نے کہا۔

''کہاں سے آرہی ہو ماں۔''

''میں پہاڑوں میں گئی تھی وہاں میں نے اس قوم کی سلامتی کے لیے دعا کی۔''

''قوم کی بڑی فکر ہو رہی ہے۔''

''اس قوم نے ہم کو سب کچھ دیا، رتبہ، طاقت اور دولت لیکن ہم نے اس قوم کو کیا دیا۔''

حکمران چیخ پڑا۔

''مہارانی اولاد کی محبت کافور ہوگئی۔ اب تم قوم کی غمخوار بن گئی۔ وہ قوم جس نے تمہارے شوہر کو ایسی موت دی کہ پانی بھی نصیب نہ ہوا۔''

''جس نے جو بویا ویسا ہی کاٹا۔ اندھیرے کے پجاریوں کو دن کی روشنی تلاش نہیں کرنی چاہیے۔''

حکمران غصہ میں ابل پڑا۔

''تم نے میرے باپ کی توہین کی۔ جو میرے باپ کی توہین کرے اس کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔''

اس نے اپنے میان سے تلوار نکالی اور مہارانی کے سینے میں اتار دی۔

ناگ راج نے خود سے کہا۔

"حکمران کی زندگی کا آخری دھاگہ بھی ٹوٹ گیا۔"

مہارانی [illegible] ارسطو اور حسینہ کو محل کے چور دروازے کا راستہ سمجھا دیا تھا۔ وہ اسی راستے سے محل میں داخل [illegible] اور خود کو ناگ راج کے سامنے پایا۔ دونوں نے ہاتھ باندھ لیے اور دو زانو [illegible] سامنے [illegible]

ناگ راج [illegible] پھن اٹھایا، ارسطو اور حسینہ کو دیکھا۔

"تم دونوں [illegible] کام کو انجام دینا جس سے ایک نئی تاریخ کی شروعات ہوگی۔"

ارسطو سر جھکا [illegible] بولا۔

"جو حکم دیوتا..... حکمران کی خاندانی تلوار بھی اب ہمارے پاس ہے۔"

"یہ حکمران کی تلوار نہیں ہے بلکہ پاتال میں بیٹھے ہوئے ناگوں کے ناگ راج کی تلوار ہے۔ اس تلوار کو یہ وردان ہے کہ یہ کسی بھی ناگ کی امر زندگی کا انت کر سکتی ہے۔ حکمران کے پرکھوں نے ناگوں کے ناگ راج کی انتھک پوجا کی۔ ناگ راج ان سے بہت خوش ہوئے اور ان کو یہ تلوار دی۔ اس دن سے حکمران کے پرکھوں کو کوئی دشمن نہیں ہرا سکا۔ جیسے جیسے وقت گزرا، حکمران کے آباؤ اجداد اپنی قوم کے لیے ظالم اور جابر بن گئے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ حسینہ کا باپ بوڑھا اور ضعیف ہونے کے باوجود وہ واحد شخص تھا جس نے حکمران کے خلاف بغاوت کا الم بلند کیا۔ وہ کامیاب ہوا۔ اس کو موت کے گھاٹ اتارا اور ہونے والے نئے حکمران کو اس قدر زخمی کر دیا کہ وہ موت کے بہت قریب پہنچ گیا۔ تب ایک ماں اپنے زخمی بیٹے کو میرے سامنے لائی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہتا دیکھ کر میرا دل پسیج گیا۔ میں نے اس نئے حکمران کو اپنے دل کا ایک حصہ دیا۔ میں نے اس کو امر بنا دیا۔ میں نے اس کی ماں سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ انصاف پسند ہوگا، ظالم اور جابر نہیں۔ وہ اپنے پرکھوں کی خونی تاریخ نہیں دہرائے گا۔ لیکن وہ انہیں کے راستے پر چلا اور اپنے باپ سے بڑا جابر اور ظالم بنا۔ جو ماں اس کی ڈھال تھی اس کو بھی قتل کر دیا۔"

ناگ راج کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے۔ پھر بولے۔

''ارسطو کوئی بھی تلوار یا ہتھیار مجھ پر اثر نہیں کر سکتا۔ لیکن میرا مرنا ضروری ہے۔ میری موت اس قوم کو ظالم اور جابر حکمران سے آزاد کرائے گی۔ میری موت حکمران کی موت ہوگی۔''

''میرے دیوتا یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔''

ناگ راج رعب دار آواز میں بولا۔

''تاریخ گواہ ہے جب بھی کسی حکمران نے خدائی کا دعویٰ کیا دیوتاؤں کو صلیب پر لٹکنا پڑا۔''

ارسطو نے کہا۔

''ناگ راج میرے دیوتا! وہ کام کرنے کا حکم نہ دیں جس سے ہم تاریخ میں داغدار ہو جائیں۔''

''زہر زہر کو مارتا ہے۔ یہ وقت گفتگو کا نہیں۔ سپاہیوں کی ایک بہت بڑی تعداد حکمران کی سربراہی میں ہماری طرف آ رہی ہے۔ تیار ہو جاؤ۔

حسینہ اٹھ اور ناگوں کے ناگ راج کی تلوار کو میرے سینے کے آر پار کر دے۔''

حسینہ روتے ہوئے بولی۔

''ناگ راج مجھ سے یہ کام نہ ہوگا۔''

''حسینہ تم ایسے باپ کی بیٹی ہو جو طاقتور حکمران کے سامنے کھڑا ہوا اور اس کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ارسطو حکمران اور اس کے لشکر کو روکو حسینہ کے لیے ڈھال بنو۔''

''جو حکم دیوتا!''

حسینہ نے تلوار اٹھائی۔ ناگ راج کی طرف بڑھی حکمران لشکر کے ساتھ دیوان خاص میں داخل ہوا اور چیخا۔

''میں امر ہوں......میں امر ہوں۔''

ارسطو نے اپنی تلوار اٹھائی اور حکمران سے بھڑ گیا۔

حسینہ نے ناگ راج کے دل میں تلوار اتار دی۔ اسی لمحے ارسطو نے اپنی تلوار حکمران

کے دل میں اتار دی۔ ناگ راج نے دم توڑ دیا۔ جابر حکمران کی بھی موت ہوگئی۔

پاتال میں بیٹھے ہوئے ناگوں کے ناگ راج کے سامنے ناگوں کا ایک ہجوم سر جھکا کر کھڑا تھا۔ سب نے ناگوں کے ناگ راج سے کہا۔

"ناگ راج مبارک ہو آپ کا بیٹا دیوتا بن گیا۔"

ناگ راج کی پانچ فٹ کی قد آور مورتی جو بہت پہلے ایک جابر حکمران نے بنوائی، آج بھی وہیں کھڑی ہے جہاں وہ نصب کی گئی تھی۔ ہر پل، ہر وقت، رات کیا، دن کیا، ہزاروں لوگ اس مورتی کی پوجا کرتے ہیں۔ ظالم حکمران کے ظلم اور جبر سے قوم کو آزاد کرانے والے نجات دہندہ کی آج بھی لوگ دن رات آرتی اتارتے ہیں۔

اپنا عکس اپنا آئینہ

۹ بجے رات!

اس یگ کی آخری کتاب کے آخری صفحے کا آخری لفظ قلمبند ہو گیا۔

عکس آئینہ میں چھپ گیا۔

ایک قد آور شخصیت کا عکس مرے ہاتھوں سے نکل کر آئینہ میں چھپ گیا۔ پانچ سال تک اس عکس کو اپنے آپ میں ڈھونڈتا رہا۔

آئینہ نے کہا ''تمہارا عکس مجھ میں جذب ہو گیا۔ لیکن تمہاری انا.....!''

آئینہ کے اس جواب کے بعد میں انا ڈھونڈتا رہا۔

میری پہچان کیا ہو گی۔ میں اپنی تاریخ خود قلمبند کراؤں گا۔

آنے والی پیڑھیوں کے لیے بے شمار محبت وراثت میں چھوڑ کے جاؤں گا۔ یہ میرا اقبال جرم ہے۔

اپنا عکس اپنے آئینے میں چھپا لوں گا۔

بیتے ہوئے یگ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ایک قد آور شخصیت نے اپنوں کے لیے اپنی پوری قوم کو یرغمال بنا دیا۔

اس یگ کے لوگ اسے یگوں پوجتے رہے اور اس کی ہر بات کو فرمان سمجھتے رہے۔ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے سادہ لوح لوگ۔ جو یہ نہ سمجھ پائے کہ فرد واحد کے لیے وہ قربان ہو رہے تھے۔

فرد واحد نے پرستاروں کی ایک ایسی مقدار چھوڑی جن کے لیے وہ ان کا ایمان تھا۔

یہ جانتے ہوئے اس فرد واحد نے ایک پوری قوم انا کی سولی پر قربان کردی۔

ایسے ہی ہوشیار اپنی چھوٹی سی دنیا انا کے لیے فنا کر دیتے ہیں۔ اور ایک ایسی تاریخ اپنے وارثوں کے لیے اپنے پیچھے چھوڑتے ہیں جس میں عدوات، بعض حسنہ، دشمنی پلتی بڑھتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے وارثوں کے لیے اچھا کرتے ہیں۔ اور انا کا سب سے دردناک پہلو یہی ہے۔ [illegible] فرد واحد انا کو اپنی [illegible]ات سے بالاتر سمجھتا ہے۔ وہ مان لیتا ہے کہ وہ دانش ور ہے اور سمجھتا ہے [illegible] اپنے اگلے [illegible] دیکھ رہا ہے۔

یہی انا کی مات [illegible] ہے۔

[illegible] ایسا اند[illegible] ہے جہاں ہر روشن چیز کالی نظر آتی ہے۔ قوموں کو تباہ کر کے رکھتی ہے۔ خاندا[illegible] مایا میں [illegible] تی ہے۔

ایک دردناک رات۔

ایک یگ سمٹ گیا۔

اگلے یگ کے لوگوں کو پچھلے یگ کا وہ بوجھ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے سروں پر اٹھانا پڑے گا.....!

تمام عمر آخری سانس تک۔

ایک المیہ کی رات تھی!

اس رات نے ایسے ان گنت نشان چھوڑے جو اگلے یگ پر خوں ریز داستان رقم کرے گی۔

ہم کم ظرفی کے اس عالم میں مست ہیں جہاں اپنے اوپر کیے ہوئے ان گنت ظلموں کا حساب نہیں رکھتے۔ کیا ہم بھی کسی انا کے شکار ہیں۔

۷ افروری ۲۰۰۷ء

کیا یہ وہ رات نہ تھی جو سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی انا سے اوپر اٹھو۔

عکس بھی مکمل ہوا، آئینہ بھی صاف ہو گیا۔

اپنا عکس اپنا آئینہ۔

میٹھا چشمہ اور میں

مجھ سے میرے جاننے والے کہتے ہیں کہ میں نے اپنی پہچان مسخ کر دی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ تم بھی کسی زمانے میں ہمارے وہ ساتھی ہوا کرتے تھے جو ان راستوں سے گذرتے تھے جو کانٹوں سے بھرے ہوتے تھے۔ اب تم دودھ سے نہاتے ہو اور اطلس سے اپنے بدن کو سجاتے ہو۔ ہیرے جواہرات سے انگلیوں کو سنوارتے ہو۔ کروڑوں کی گاڑی میں گھومتے ہو۔ افسوس تم کو کانٹوں سے بھرے راستے راس نہ آئے۔ تم نے کاغذ پر کتنے بت تراشے، کہاں گیا وہ تخلیق کار!

وقت کے تھپیڑوں نے، زر کی چمک نے تمہاری سوجھ بوجھ تم سے چھین لی تم جادوئی نگر کے باشندہ بن گئے، ہر جادوئی چیز کو سچ ماننے لگے۔ اور اپنی آنکھوں کو اس سختی کے ساتھ بند کر کے رکھا تا کہ تمہارے آنکھوں سے تمہارا خواب کوئی نہ چرا لے۔

خوابوں میں رہنے والے کم ظرف جاگو!

اس المناک رات کے چار بجے!!

اس رات پینتالیس سالہ وہ آدمی جو خود کو بچہ سمجھتا تھا، اچانک بوڑھا ہو گیا۔ جادوئی نگر، جادوئی چیزیں تتر بتر ہو گئی۔ خوابوں کی دنیا سے اس کو بہت دور پھینکا گیا۔ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں وہ اس قدر مست تھا کہ اسے احساس نہ ہوا کہ اس کے پاس جو میٹھا چشمہ تھا وہ کتنا دور چلا گیا۔ وہاں جہاں تک اس کی رسائی نہیں تھی۔

وہ المناک رات! خوفناک حقیقت!!

اس رات کے بعد ہر رات وہ آنکھوں میں کاٹتا رہا۔

ایک مقدس آواز سرگوشیوں میں کہتی تھی

''بیٹا اٹھ ابھی تمہیں بہت لمبا راستہ طے کرنا ہے۔''

راستہ لمبا ہے، وقت کم ہے۔ میری آنکھوں کے آنسو بھی سوکھ گئے۔

میں پیاسا ہوں۔ میٹھا چشمہ مجھ سے بہت دور ہے!

بہت دور ہے!!

عجب پریم کہانی

عجب پریم کہانی کے بانکے نوجوان نے جب حسینہ کو دیکھا تو بے ساختہ بول پڑا۔
'تم جیسا کوئی نہیں....!'
حسینہ نے اپنے آوارہ بالوں کو اپنے چہرے سے ایک ادا کے ساتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔
'تمہارا بھی جواب نہیں....!'
اس شہر کے لوگوں نے اس عجب پریم کہانی کو پروان چڑھتے ہوئے دیکھا۔
گواہ بن گئے ان کی پریم کہانی کے لہلہاتے ہوئے کھیت، بل کھاتی ہوئی ندیاں، مسکراتے ہوئے پھول، گنگناتے ہوئے پرندے، آسمان سے باتیں کرتی ہوئی پہاڑیاں۔اس شہر کا ہر باشندہ اس پریم کہانی کا حصہ بن گیا تھا۔
اچانک اس شہر کو ایک کالی آندھی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔آناً فاناً سنسناتی ہوئی گولیوں نے شہر کی خاموشی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔اس کی سرزمین لہولہان ہوگئی۔ایک گولی نوجوان کے سینے کو پار کرگئی۔اس کے نیم مردہ جسم کو گاڑی کے اندر ایسے پھینکا گیا جیسے کسی مردہ جانور کو!
حسینہ نے جب اپنی پریم کہانی کو اپنی آنکھوں کے سامنے راکھ ہوتے دیکھا تو یہ صدمہ برداشت نہ کرسکی۔غش کھا کر بے ہوش ہوگئی۔اس کالی رات کو آسمان بھی رویا۔اس واقعہ کے تیس سال تک وہ شہر غم میں ڈوبا رہا۔
تیس سال کے بعد سنہری دھوپ میں ایک ادھیڑ عمر کی پرکیف شخصیت اس شہر میں

وارد ہوئی۔

وہ ایک مشہور و معروف ڈاکٹر تھا۔ اور اس شہر کی ایک رحم دل عورت کے بلاوے پر آیا تھا۔ رحم دل عورت نے ایک بیمار بچے کے علاج کے لیے اسے بلایا تھا۔ جو موت اور زندگی کی لڑائی لڑ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے معصوم بچے کا معائنہ کیا اور اپنے ارد گرد ڈاکٹروں کی ٹیم سے بولا۔

'بہت مشکل ہے، بہت مشکل!!'

ایک نوجوان ڈاکٹر اپنے سینئر ڈاکٹر سے بولا۔

'آپریشن تو ہوگا؟'

'آپریشن ضرور ہوگا لیکن پہلے کچھ ٹیسٹ کرنے ہوں گے۔''

دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔

'سر! آپ کے اعزاز میں میڈم نے اپنی حویلی میں آج شام ایک پارٹی رکھی ہے۔ میں آپ کو شام کو حویلی لینے آؤں گا۔'

ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ 'ٹھیک۔'

اس خوبصورت شام شاندار حویلی میں جگمگاتی ہوئی روشنیوں میں ڈاکٹر نے میڈم کو دیکھا تو کچھ دیر کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ بول پڑا۔

'حسینہ'

میڈم بولی۔

'کیسے ہو ڈاکٹر صاحب! آپ کا سفر ٹھیک رہا۔'

'میں ٹھیک ہوں' ڈاکٹر نے کہا 'یقین نہیں آ رہا۔'

'حقیقت کبھی کبھی یقین کو بھی دھوکہ دے جاتی ہے۔'

ڈاکٹر بولا۔

'ہاتھ میں ہاتھ، تیس سال کا وقفہ ایک لمحے میں تبدیل ہوگا۔'

حسینہ بولی۔

'ہم وہاں کھڑے ہیں جہاں سمندر بیچ میں ہے۔'

وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت دیر تک دیکھتے رہے۔

وقت جیسے ٹھہر گیا۔ حسینہ نے اپنے آپ کو اس کیفیت سے دور [illegible] وہ بولی۔

'میرا بچہ۔'

ڈاکٹر نے پوچھا 'تمہاری شادی کب ہوئی۔'

حسینہ بولی 'شادی کا خیال نہ دماغ میں آیا نہ دل میں۔'

'یہ بچہ۔'

'یہ بچہ میرا ہے' حسینہ نے کہا 'اور تمہاری شادی۔'

'ہاں! اب وہ اس دنیا میں نہیں۔'

'کوئی اولاد' حسینہ نے معلوم کیا۔

'ہاں.... بیٹی۔'

'کہاں؟'

'معلوم نہیں۔'

'ایسا کیوں؟'

ڈاکٹر بولا۔

'وہ سمجھتی ہے کہ میں نے اس کی ماں کو وہ پیار نہیں دیا جس کی وہ حقدار تھی۔'

'کیا وہ غلط تھی۔'

'نہیں وہ صحیح تھی۔'

'شادی کیوں کی؟'

'بھول۔'

'تمہاری بھول کی سزا دوسرا کیوں بھگتے۔'

'اب میں بہت آگے نکل چکا ہوں۔'

'اور اپنے قدموں کے نشان چھوڑتا جا رہا ہوں۔'

'تمہاری بیٹی کہاں ہے، کس حال میں ہے؟'

کسی نے کہا اس نے شادی کی..... اطلاع نہیں دی۔

'کیا تم وہی ہو جو مجھ سے ملتے رہے' حسینہ کی آواز میں مایوسی ٹپکتی تھی۔

ڈاکٹر حسینہ کے چہرے کو تکتا رہا۔

'خیر......! میرا بچہ میری دنیا ہے۔'

ڈاکٹر نے کہا 'سخت بیمار ہے۔'

حسینہ دردناک آواز میں بولی۔

'ڈاکٹر میرے بچے کو بچالو۔ یہ تمہارا احسان ہوگا۔'

اس طویل ملاقات کے بعد ڈاکٹر اپنے ہوٹل کے کمرے میں آیا۔ وہ خود کو بھاگتے ہوئے وقت کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ نینداس کی آنکھوں سے غائب ہوگئی۔

وقت کے تھپیڑوں نے حسینہ کو بدل ڈالا۔ ڈاکٹر نے خود سے کہا۔

'یا میں خود بدل گیا ہوں؟'

ڈاکٹر بچے کے علاج میں دن رات ایک کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کو یہ نہ معلوم پڑتا کہ کب رات ہوئی کب دن شروع ہوا۔ پھر وہ دن آیا جب بچے کا آپریشن ہوا۔ حسینہ آپریشن تھیٹر کے سامنے گھنٹوں کھڑی رہی۔ حسینہ نے بچے کو آپریشن سے پہلے خوب پیار کیا اور ڈاکٹر سے کہا۔

'میں اپنے بچے کو تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔'

'دعا کرو۔'

سات گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد جب ڈاکٹر تھیئٹر سے باہر آیا حسینہ اس کی طرف دوڑتی ہوئی آئی۔ ڈاکٹر نے لرزتی آواز میں کہا۔

'بچے کی حالت نازک ہے۔'

حسینہ لڑکھڑائی، آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ نرس تھیئٹر سے دوڑتی ہوئی آئی۔

'ڈاکٹر..... بچے کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'

ڈاکٹر دوبارہ جب آپریشن تھیئٹر سے واپس نکلا اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ دھیمی آواز

میں بولا۔

'مجھے افسوس ہے میں بچے کو بچا نہ سکا۔'

حسینہ کی آنکھوں کے آنسو جذب ہو گئے۔ وہ بت کی طرح کھڑی رہی۔

اس شام بچے کو سپرد خاک کیا گیا۔

ڈاکٹر اس شام ہوٹل کے کمرے میں خود کو کوستا رہا اور یہ سوچتا رہا [illegible] نے کہاں غلطی کی۔

وہ اپنے آپ سے بولا۔

'حسینہ کی خواہش بھی پورا نہ کر سکا۔'

اگلے دن وہ حویلی گیا۔ حسینہ اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ تین دن تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ چوتھے دن ڈاکٹر واپس اپنے شہر جانے کے لیے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ آدھا راستہ طے ہوا جب اس نے ڈرائیور سے کہا۔

'حویلی کی طرف گاڑی موڑلو۔'

حسینہ حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی بچے کی تصویر کو تک رہی تھی۔ حسینہ نے جب ڈاکٹر کو آتے ہوئے دیکھا تو کہا۔

'ڈاکٹر صاحب آیئے۔'

'کیسی طبیعت ہے؟'

'یوں لگتا ہے تین صدیاں گذر گئیں۔' کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد وہ بولی۔

'مجھے آپ کو حقائق سے دور نہیں رکھنا چاہیے۔'

حسینہ رک گئی اور پھر سوچوں کی دنیا میں کھو گئی۔

ڈاکٹر بول پڑا 'کون سے حقائق۔'

'صبح سویرے میری آنکھ لگ گئی۔ میرے خوابوں میں ننھا فرشتہ آیا۔ وہ مجھے کہنے لگا ڈاکٹر کا حق ہے کہ وہ حقیقت جانے۔'

ڈاکٹر پھر بول پڑا 'اب کیا فیصلہ کیا؟'

حسینہ نے ڈاکٹر کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے کہا۔

'تمہاری بیٹی اور تمہارا داماد ایک بھیانک حادثے کے شکار ہو گئے۔ تمہاری بیٹی کا شوہر موقعے پر فوت ہو گیا تمہاری بیٹی کو نزدیک کے اسپتال میں لایا گیا۔ اس اسپتال سے مجھے فون آیا کہ تمہاری بیٹی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہے اور مجھے ڈھونڈ رہی ہے۔ یہ سب کچھ میرے لیے باعث پریشانی اور حیرانی کا معاملہ تھا۔ بہر حال میں اسپتال چلی گئی۔' حسینہ کچھ دیر خاموش رہ کر پھر بولی۔

'آپ کی بیٹی زندگی کے آخری لمحوں میں مجھ سے بولی۔'

'حسینہ میں تمہاری بے حد شکر گزار ہوں کہ تم آ گئی۔ میں اور میرا شوہر تم سے ملنے آ رہے تھے لیکن یہ حادثہ ہو گیا۔ میں تم کو اس لیے دیکھنے آ رہی تھی کہ میرے باپ نے کس عورت کے لیے میری ماں کو تمام عمر اپنی محبت کے لیے ترسایا۔ میرا باپ ایک پل تم سے جدا نہیں رہا۔

پھر وہ رک رک کے بولی۔

'میری آخری خواہش پوری کرو گی۔'

میں نے کہا۔

'بول میری بچی بول!'

'میرے باپ کو نہ معلوم ہو کہ میں اس دنیا میں نہیں ہوں اور میرے بچے کو اپنے زیر سایہ رکھنا۔ تمہارا اکرم ہو گا۔'

'میری بچی یہ تم نے مجھ پر کرم کیا۔'

یہ سنتے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

'کچھ دنوں کے بعد میں بورڈنگ اسکول سے بچہ لے آئی۔ وہ بچہ آج مجھ سے بہت دور چلا گیا۔ آپ کی بیٹی کو دیا ہوا وعدہ میں نبھا نہ پائی۔'

حسینہ کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو گرنے لگے۔

'میرا پوتا..... میرا پوتا۔' ڈاکٹر پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔

پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔

دس دن کی علالت کے بعد ڈاکٹر کی حالت بہتر ہونے لگی۔ حسینہ نے دن رات ڈاکٹر کی نگہداشت کی۔ راتوں کو سوئی نہیں، دنوں کا پتہ نہ چلا۔ ڈاکٹر جب ہوش میں آیا تو حسینہ سے کہا۔

'تم نے میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے بہت کچھ کیا! میں.....

حسینہ نے کہا۔

'چپ!.........میں نے سب کچھ اپنے لیے کیا۔'

عجب پریم کہانی کا ڈاکٹر حسینہ کی آنکھوں میں سما گیا۔

لمبا آدمی چھوٹا قد

چھوٹے قد کے آدمی نے لوگوں کی بھاری تعداد کو مخاطب کر کے کہا۔

'جھنڈ میں سور آتے ہیں، شیر اکیلا آتا ہے۔'

پھر چھوٹے قد کے آدمی نے ایک لمبے قد کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔

'یہ وہ شیر ہے جو ہر بلا اور آفت کا مقابلہ کرے گا۔ اس قوم کا شیر اس قوم کی رہنمائی کرے گا اور قوم کو منزل مقصود تک لے جائے گا۔ ہمارے اس قد آور شیر میں جذبہ ہے ہمت ہے لگن ہے اور یہ سب کچھ اپنی قوم کو دینے کے لیے ہے۔'

لوگوں کا ایک بڑا ہجوم کھڑا ہو کر ناچنے لگا۔

جن کے پاس شیر ان کو کیا پرواہ۔

وقت کے سیلاب نے تاریخ کے ایسے صفحے لکھے کہ وہ چھوٹے قد کا آدمی جو کسی زمانے میں لمبے قد کے آدمی کی آنکھیں تھا کان تھا اور دماغ۔ گم ہو کے رہ گیا۔

پھر وہ چھوٹے قد کے آدمیوں کے سامنے کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

سنو بھائیو! میرا سر قلم کر دیا گیا، میری آنکھوں کی بینائی، سرخ انگارے جیسی سلاخوں سے چھین لی گئی۔ میرے کانوں میں شیشہ ڈالا گیا۔ میرا دماغ مجھ سے علیحدہ کیا گیا۔ میں.... اندھا ہوں بہرہ ہوں میری سوچ مجھ سے الگ کی گئی۔

کسی نے کہا۔

'یہ سب ہوا اور ہمیں خبر تک نہیں......!'

دس دن کی علالت کے بعد ڈاکٹر کی حالت بہتر ہونے لگی۔ حسینہ نے دن رات ڈاکٹر کی نگہداشت کی۔ راتوں کو سوئی نہیں، دنوں کا پتہ نہ چلا۔ ڈاکٹر جب ہوش میں آیا تو حسینہ سے کہا۔

'تم نے میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے بہت کچھ کیا! میں..

حسینہ نے کہا۔

'چپ!..........میں نے سب کچھ اپنے لیے کیا۔'

عجب پریم کہانی کا ڈاکٹر حسینہ کی آنکھوں میں سما گیا۔

لمبا آدمی چھوٹا قد

چھوٹے قد کے آدمی نے لوگوں کی بھاری تعداد کو مخاطب کر کے کہا۔

'جھنڈ میں جانور آتے ہیں، شیر اکیلا آتا ہے۔'

پھر چھوٹے قد کے آدمی نے ایک لمبے قد کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

'یہ وہ شیر ہے جو ہر بلا اور آفت کا مقابلہ کرے گا۔ اس قوم کا شیر اس قوم کی رہنمائی کرے گا اور قوم کو منزل مقصود تک لے جائے گا۔ ہمارے اس قد آور شیر میں جذبہ ہے ہمت ہے لگن ہے اور یہ سب کچھ اپنی قوم کو دینے کے لیے ہے۔'

لوگوں کا ایک بڑا ہجوم کھڑا ہو کر ناچنے لگا۔

جن کے پاس شیر ان کو کیا پرواہ۔

وقت کے سیلاب نے تاریخ کے ایسے صفحے لکھے کہ وہ چھوٹے قد کا آدمی جو کسی زمانے میں لمبے قد کے آدمی کی آنکھیں تھا کان تھا اور دماغ۔ گم ہو کے رہ گیا۔

پھر وہ چھوٹے قد کے آدمیوں کے سامنے کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

سنو بھائیو! میرا سر قلم کر دیا گیا، میری آنکھوں کی بینائی، سرخ انگارے جیسی سلاخوں سے چھین لی گئی۔ میرے کانوں میں شیشہ ڈالا گیا۔ میرا دماغ مجھ سے علیحدہ کیا گیا۔ میں.....! اندھا ہوں بہرہ ہوں میری سوچ مجھ سے الگ کی گئی۔

کسی نے کہا۔

'یہ سب ہوا اور ہمیں خبر تک نہیں......!'

چھوٹے قد کے آدمی نے کہا۔

'کیا تمہیں معلوم نہیں شیر کے حواری شیر کی کھال پہن کر شہر ڈھونڈتے ہوئے گھوم رہے ہیں۔'

اس آدمی نے کہا۔

'اچھا مذاق کر رہے ہو۔ تم شیر کی روح ہو۔ روح کیسے جسم سے الگ ہوگیا۔ بے جان جسم مٹی کا خول نہیں رکھتا۔'

چھوٹے قد کے آدمی نے کہا۔

اس مٹی کے پتلے کو آپ لوگ پوجتے ہو۔ یہ اس قوم کی کمر ہے۔'

پھر اس آدمی نے کہا۔

'کیا تم اس قوم کا حصہ نہیں ہو؟'

چھوٹے قد کے آدمی نے کہا۔

'اس حقیقت سے کب انکار!'

پھر اس آدمی نے کہا۔

'یہ سب ہونے کے باوجود تم نے کب اس قوم کے بارے میں سوچا۔'

چھوٹے قد نے غصہ سے کہا۔

'میں نے چاہا تھا زہر ہلاہل زہر سے کاٹ دوں لیکن ......'

آدمی نے کہا۔

'اب کیسا پچھتاوا؟'

چھوٹے قد کے آدمی نے کہا۔

'اس لیے کہ میں اپنے پیچھے کوئی ایسی وراثت چھوڑے نہیں جا رہا ہوں جس کو یاد کیا جائے۔ وہ زندگی کے آخری لمحوں میں بہت رویا۔ لیکن اب بے سود۔ اس آوارہ گردی نے ایک معصوم کو یرغمال بنا دیا۔ اس نے اپنے آخری وقت میں کہا۔ آپ لوگوں کی عنایت ہوگی کہ مجھے یاد نہ کرنا۔

وہ صبح کب آئے گی

چلو......چلو......چلو!!!

ایک نہیں......دو نہیں......دس نہیں......سب چلو۔ جوق در جوق چلو!

اپنے بچوں کو اپنے ساتھ لے چلو۔ وہ بھی تاریخ کا حصہ بننے جا رہے ہیں۔ لیکن خیال رہے کہیں اس بھیڑ میں نہ کھو جائیں۔

بھیڑ کے سامنے ایک وسیع میدان تھا۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے ان مقبروں سے گذرنا ہوگا جہاں لاکھوں لوگ سوئے ہوئے ہیں۔ اس میدان کو پار کرنے کے بعد ہم ان ہواؤں میں سانس لینے لگیں گے، جو ان غموں کا مداوا ہوگی، نئی صبح کا ضامن ہوگی۔

یہ لوگ اس مٹی کی پیداوار ہیں جس کی جھیل کا صاف شفاف پانی ان کے اعمالوں سے غلیظ ہو گیا۔ جہاں کے سرسبز جنگل بھی ریگستان بن گئے۔ اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم سے نفرت نہ کرو کیونکہ نفرت ہم سے پشیمان ہو جائیگی۔ ہم پر ترس نہ کھاؤ کیونکہ ترس بھی ہزاروں سوال کھڑے کرے گی۔ ہم وہ ہیں جو اپنے بچوں کو اپنے خمیر سے خود واقف کرتے ہیں کیونکہ ہم اپنے آپ پر کبھی شرمندہ نہیں ہوتے۔

دور میدان میں کسی کونے سے آواز آئی۔

"ہوشیار.....نظر پاک۔"

اس بھیڑ میں کچھ بونے بھی تھے، کچھ لنگڑے بھی تھے، اندھے بھی تھے، بہرے بھی تھے۔ روگی بھی تھے، ہر رنگ، ہر نسل کے لوگ۔ یہ سب دن کی روشنی میں کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتے اور ان خوابوں کو پالتے اور خوابوں کے کیے ہوئے وعدوں پر یقین رکھتے۔

لوگوں کی اس بھیڑ کو یہ بھی یقین ہے کہ جو میدان پار کر جائے گا وہ ان ہواؤں میں سانس لیگا جو دکھوں کا مداوا ہوگی اور اسے نئی صبح دیکھنی نصیب ہوگی۔

ان خوابوں کا یہ المیہ ہے کہ لوگ اپنے آپ سے، اپنی ذات سے بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ جادوگر کی طرح اپنی دنیا خود ہی سجاتے ہیں اور خود ہی اسے مٹاتے ہیں خود ہی بت کھڑا کرتے ہیں، خود ہی بتوں کو توڑتے ہیں۔

یہ لوگ گرمی میں ٹھنڈی ہواؤں کو یاد کرتے ہیں اور ٹھنڈ میں گرمی کو۔ خود اپنی دنیا بناتے ہیں، خود ہی اپنی دنیا کو تہس نہس کرتے ہیں۔

اس میدان میں ایک اونچے منبر پر سفید پوشاک پہنے ایک لمبے قد کا ایک آدمی لوگوں سے کہہ رہا تھا۔

''جو مجھ سے وفا کرے گا وہی میدان پار کرے گا۔''

میدان کے دوسرے کونے سے آواز آرہی تھی۔

''ہوشیار......خبردار۔''

اس میدان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ جو میدان پار نہیں کرے گا وہ میدان میں ضم ہو جائے گا۔

میدان میں قیامت کا شور برپا تھا۔ ہر طرف آوازیں آرہی تھیں۔ بھانت بھانت کی آوازیں۔ انسانوں کی، پرندوں، چرندوں کی۔

میدان میں کچھ لوگ ننگے اور آوارہ گھوم رہے تھے، لوگوں سے کہہ رہے تھے۔

'کھو جاؤ گے، پھر نہ ملو گے۔'

وہ لوگ جو یاقوت زمرد، الماس، چاندی اور سونے کو اپنا شفیق اور رفیق مانتے تھے، عزیزوں کی موت پر روتے تھے، ننگے اور آوارہ لوگ ان سے کہہ رہے تھے۔

'آنسوؤں کو سنبھال کے رکھو، کسی اور دن کام آئیں گے۔'

میدان کو پار کرنے کی تگ و دو میں لوگ ایک دوسرے کو دھکیلنے میں بھی لگے ہوئے تھے۔ کوشش یہ تھی کہ ایک دوسرے سے سبقت لے جائے تا کہ وہ ان ہواؤں میں سانس لے

جہاں غموں کا مداوا ہوگا۔

'ہوشیار......غرض مند ہوشیار'

اس آواز کو لوگ ان سنی کر دیتے کیونکہ غرض میں آدمی اندھا بھی ہو جاتا ہے اور بہرہ بھی۔

لوگوں کی یہ بھیڑ بے تحاشا دوڑ رہی تھی نہ دائیں دیکھ رہی تھی نہ بائیں۔ بس ایک دھن سوار تھی کہ وہ ان ہواؤں کو اپنی سانسوں میں اتار لے جو ان کے غموں کا مداوا کر سکے۔

اس دوڑ میں وہ ان عزیزوں کی قبروں کو بھی روندتے جا رہے تھے جن کے لیے وہ کبھی روتے تھے۔

کچھ لوگ مقصد کے بہت قریب پہنچ گئے، ان کے چہروں پر شادمانی جھلک رہی تھی۔ یکایک کہیں سے ننگے، بے حال لوگوں کا جھنڈ ابھرا۔ اور ان سے کہنے لگا۔ کتنے قریب ہو..... اور اب بھی کتنے دور ہو۔ اچانک تیز ہواؤں کی موسلا دھار بارش، زلزلوں کے جھٹکوں اور اندھیرے نے سارا ماحول خوفناک بنا دیا۔ اچانک طوفان کے اس ریلے نے ان لوگوں کو اپنے لپیٹے میں لے لیا اور وہ ان ہواؤں کو خود میں نہ اتار سکے۔ جو ان کو غموں کا مداوا ہوتی۔ میدان کی مٹی نے پھر ایک بار ان لوگوں کو اپنے آپ میں ضم کر دیا۔

آئندہ بھی بہت لوگ آئیں گے اور ان ہواؤں کو اپنے اندر اتار لینے کی کوشش کریں گے جو غموں کا مداوا ہوگی۔

نہ معلوم وہ لوگ کب آئیں گے جو ان ہواؤں کو اپنے اندر اتار لینے میں کامیاب ہوں گے۔ کب وہ خوش قسمت لوگ آئیں گے۔ اس لمحے کا سب کو انتظار ہے۔ پھر سارے لوگ ان کے ساتھ جلوس میں شامل ہوں گے اور وہ لوگ جو قبروں میں سو رہے ہیں وہ بھی قبروں سے نکل کر ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔

نہ جانے وہ صبح کب آئے گی!

سرخ چادر

انسانی ذہن بچپن سے ہی مختلف رنگوں سے اثر لیتا ہے۔ کسی کو سبز رنگ زیادہ پسند ہے تو کسی کو سرخ رنگ اور کسی کو ان دونوں رنگوں سے اس قدر نفرت ہوتی ہے کہ وہ ان دونوں رنگوں کو اپنے پاس بھٹکنے بھی نہیں دیتا ہے۔ عام انسان رنگوں کے بارے میں غیر معمولی حد تک سنجیدہ نہیں ہوتے۔ لیکن سدھیر رنگوں کے بارے میں غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھا۔ یوں تو وہ تیس سال کا نوجوان تھا جس نے تھوڑے سے عرصے میں اپنے انوکھے کاروبار سے کافی پیسے بنائے تھے۔ اس کمائی سے وہ مکان بنانا چاہتا تھا۔ اس وقت اس کے کرائے کے مکان میں سیٹھ کرتار سنگھ بیٹھا تھا۔ سیٹھ شہر کا مشہور و معروف ٹھیکیدار تھا۔ سدھیر نے کہا۔

"ہاں تو سیٹھ صاحب میرے اس چھوٹے بنگلے میں جے پور کے سرخ پتھر لگنے چاہئیں۔"

"لیکن حضور اینٹ کیوں نہیں لگا دیتے۔ ایک تو اس سے قیمت میں بھی کمی ہوگی۔ زیادہ تر جدید مکانات بھی اینٹوں سے ہی بنتے ہیں۔"

"لیکن مجھے صرف سرخ رنگ پسند ہے۔ وہ بھی جو جے پور کے پتھروں میں ہوتا ہے۔ اندر کی دیواروں کا رنگ بھی سرخ ہونا چاہیے۔ فرش پر جو سیمنٹ لگایا جائے اس کا رنگ بھی سرخ ہونا چاہیے۔"

"یہ تو مرضی ہے آپ کی۔ ویسے اس بنگلے کا نام بھی آپ کو سرخ بنگلہ رکھنا چاہیے۔"

"وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے......بن جائے گا" ٹھیکیدار نے کہا "ویسے بھگوان سے میری یہی دعا

ہے کہ اس نئے مکان میں داخل ہوتے ہی آپ کی شادی ہو جائے۔"

"دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟"

"یعنی کوئی نظر میں نہیں ہے۔"

"نہیں، [illegible] کوئی بات نہیں ہے۔"

"اچھا [illegible] کہ جلد ہی ایسا موقعہ آجائے۔" ٹھیکیدار نے ہنستے ہوئے کہا۔

[illegible] کا نیا مکان [illegible]ا شروع ہو گیا۔ نیا مکان بنواتے ہوئے وہ صرف سرخ رنگ ذہن میں [illegible] تھا۔ یہاں [illegible] کہ باغ بننے سے پہلے ہی اس نے سرخ رنگ کے پیچ ڈھونڈ نکالے۔

سدھیر موٹر سائیکل سے مکان کی اور جارہا تھا کہ بیس سال کی ایک لڑکی اس کی موٹر سائیکل کے نیچے آنے سے بال بال بچی۔ سدھیر نے موٹر سائیکل کھڑی کی۔ لڑکی زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہاں وہی...... وہی لڑکی جس کی وہ تلاش کر رہا تھا۔ سرخ ساڑی میں ملبوس...... سرخ رنگ اس کے گالوں پر چھایا ہوا تھا اور اس کے دلکش چہرے کو چار چاند لگا رہا تھا۔ وہ اس کو صرف دیکھے جارہا تھا۔

"اندھے ہو گیا؟...... دیکھ کے نہیں چلتے۔"

"اندھے تو ہو ہی اب بہرے بھی نکلے۔"

سدھیر سنبھل گیا۔ اس نے کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ سرخ ساڑی میں بہت حسین لگ رہی ہیں۔"

"او...... شٹ اپ۔"

سدھیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس بات میں کچھ حقیقت ہے کہ آج کل کی حسین لڑکیاں پیار کا آغاز شٹ اپ سے کر رہی ہیں۔"

"او...... تم تو پرلے درجے کے لوفر بھی لگتے ہو۔"

''یہ تو پیار کی سیڑھی کا دوسرا زینہ ہے۔''
لڑکی چیخ پڑی۔
''تم لفنگے۔''
''اجی پھر تو پیار ہو ہی گیا۔''
یہ چھیڑ چھاڑ رنگ لائی۔ لڑکی کا نام بملا تھا۔ ایک دن سدھیر نے بملا سے کہا۔
''بملا بہت جلد میرا اپنا مکان تیار ہو رہا ہے۔ جانتی ہو وہاں جاکر میں پہلا کام کیا کروں گا۔''
''کیا؟''
''تم سے شادی۔''
بملا شرما گئی۔ وقت بھی گزرنے لگا۔ وہ وقت بھی آیا۔ جب سدھیر کا نیا مکان تیار ہو گیا۔
سدھیر کا والدہ کے علاوہ اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ اس دن والدہ کے علاوہ بملا بھی اس کے ساتھ تھی۔ ٹھیکیدار نے کہا۔
''سدھیر بابو آپ کو نیا مکان مبارک ہو۔''
''شکریہ۔''
پھر پنڈت جی کے کچھ مذہبی رسومات کے بعد بملا سدھیر اور سدھیر کی ماں نئے مکان میں داخل ہوئے۔ سدھیر نے بملا سے کہا۔
''آؤ بملا میں تمہیں مکان دکھاتا ہوں۔''
سدھیر کی ماں نے کہا۔
''ہاں........ ہاں.......جاؤ بیٹی۔''
سدھیر نے ایک کمرے کو دکھاتے ہوئے کہا۔
''بملا یہ ہماری لائبریری ہوگی۔''
دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھو......اس کمرے میں کبھی کبھار، ہم تاش، کیرم بورڈ کھیلا کریں گے۔''

بملا سرخ ساڑی میں آسمان کی حور لگ رہی تھی۔ ایک اور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

''یہ ہوگا ہمارا بیڈروم۔''

بملا شرما گئی۔

''اور یہ دیکھو......بیڈ......ہاں......بیڈ۔''

بملا سدھیر کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ بیڈ پر سرخ رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی...... سرخ رنگ کی ساڑی......سرخ رنگ کی چادر......سرخ......سرخ۔

سدھیر کے اوسان خطا ہونے لگے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اب دماغ پھٹا......اب پھٹا۔

وہ چیخ پڑا۔

''نرملا۔''

پھر اس کے ہاتھوں میں بملا کی گردن تھی۔ بملا کی گردن اس کے ہاتھوں سے آزاد ہونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سدھیر کہہ رہا تھا۔

نرملا......تم بے وفا ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ سدھیر کی ماں دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔

''سدھیر۔''

اس نے بڑی مشکل سے بملا کو سدھیر کے ہاتھوں سے الگ کیا۔

''پاگل ہو گئے ہو؟''

''نرملا......نرملا۔''

ماں کہنے لگی۔

''اف بھگوان......ایسا ہوا......نا......آخر۔''

سدھیر بے ہوش ہو کر بیڈ پر گر گیا۔ بملا ہوش میں آ گئی سدھیر کی ماں نے بملا سے

کہا۔

''بیٹی اب تم سے کیا چھپاؤں۔''

''کیا بات ہے ماں جی!'' بملا نے اپنی آواز کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''یہ سدھیر کو اچانک کیا ہوا۔''

''بتاتی ہوں'' اس نے دم لیتے ہوئے کہا۔ ''بہت دنوں کی بات ہے، جب سدھیر صرف تین سال کا تھا۔ اس کے پتا جی ایک طوائف سے محبت کر بیٹھے۔ ان طوائف کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ ایک سے سو کمانا اور دوسرے سے دو سو۔ لیکن سدھیر کے پتا جی بھی سمجھ رہے تھے کہ طوائف ان سے سچا پیار کرتی ہے۔ لیکن ایک دن جب ان کے ساتھ سدھیر تھا، یہ راز کھل گیا۔ سدھیر کے پتا کو بہت غصہ آیا۔ وہ طوائف پر برس پڑے۔ ''نرملا...... نرملا...... تم بے وفا ہو۔'' نرملا اس وقت سرخ چادر پر آرام فرما تھی۔ انہوں نے غصے میں پھل کاٹنے والی چھری نرملا کے سینے میں گھونپ دی۔ سدھیر اس حادثے کو دیکھ کے بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ بڑبڑاتا رہا۔ ''نرملا تم بے وفا نکلی۔'' ڈاکٹر کے علاج نے سدھیر کو ٹھیک کر دیا۔ لیکن یہ بھی ہدایت دی کہ سدھیر کے سامنے کبھی سرخ چادر نہ رکھنا۔ ورنہ اس کو دوبارہ دورہ پڑ سکتا ہے۔''

سدھیر کی ماں خاموش ہوئی۔ بملا خاموش تھی اور سدھیر کے چہرے پر اطمینان کی نیند تھی۔ سدھیر کی ماں نے بملا سے کہا۔

''بملا تم ہی میرے بیٹے کو سنبھال سکتی ہو۔''

بملا فیصلہ نہ کر پائی کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔

تصویر

آپ تصویر بنائیں

لڑکی کی سریلی آواز مجھے تصور کی دنیا سے واپس لائی۔ کینوس ایزل پر چڑھ گیا تھا۔ اب صرف رنگوں کو پھیلا دینا تھا۔

اور......اب ماڈل گرل بھی تیار تھی۔

وہ دراز قد کی پتلی سی لڑکی۔ بہت گوری بھی نہیں تھی۔ لیکن اس کے نقوش بڑے تیکھے تھے۔ سڈول جسم پانچ چھ سو روپے کی ساڑی میں بند تھا۔

میں نے لکیروں کا انداز پکڑا۔

لکیروں نے عجیب مگر بہت زیادہ پرکشش پیچ وخم اختیار کیے۔ ''میں فنکار ہوں، حسن کی تعریف کرنا میری فطرت ہے۔'' میں نے لڑکی سے کہا۔

لڑکی کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔ مگر بہت جلد اس پر سنجیدگی واپس آ گئی۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''میں ماڈل گرل ہوں۔''

''لیکن حسین تو ہو۔''

''وقت ضائع مت کرو۔ ورنہ خرچ کرتے رہو گے اور خود بھوکے رہو گے۔''

''تم ہر بات کیوں کاروبار کے ترازو میں تولتی ہو۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ میں ماڈل گرل ہوں اور میری اجرت فی گھنٹہ ہزار روپے ہے۔''

''لیکن اس سے تمہارا کیا نقصان ہے؟''

''نقصان ہے۔ ورنہ میں تمہیں کیوں ٹوکتی۔ مثال کے طور پر تصویر پانچ گھنٹے میں مکمل ہوگی۔ اور چھ ہزار روپے میں فروخت ہوگی۔ تمہیں نفع ہوگا۔ مگر یہی تصویر اگر پانچ کے بدلے دس گھنٹے میں تیار ہو۔ پھر چھ ہزار میں فروخت ہو تو تمہیں بھی نقصان اور مجھے بھی۔ تمہارا کاروبار ٹھپ ہوگا۔ میری آمدنی کا یہ سلسلہ بھی بند ہوگا۔ بتاؤ..... اس طرح میرا نقصان ہوگا..... نا۔''

یہ ایک اچھا کاروباری نکتہ تھا۔ لیکن میں مصور ہوں۔ کوئی کاروباری نہیں۔ حالانکہ غم اور مجبوریوں کے دلدل میں پھنسا ہوا ہوں۔ پھر بھی آنکھیں کھولنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ایک اندھی دوڑ دوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

میں نے کہا۔ ''تم نے کبھی پیار کیا ہے؟''

''پیار کے لیے فرصت ہونی چاہیے مسٹر۔''

''مجھ جیسی ماڈل گرل کی دنیا بے حس ہوتی ہے۔ ہمارے دل میں دھڑکن پیدا نہیں ہوتی۔ وقت کی تند اور تیز ہواؤں نے اس کو پتھر بنا دیا ہوتا ہے۔ افلاس کی چھاؤں بڑی ظالم ہوتی ہے۔''

میں نے سوچ کر کہا۔

''دنیا کے حوادث انسان کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ ذہنوں کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ زندگی کے رخ کو موڑ دیتے ہیں۔ مگر پھر بھی آدمی دل کے سہارے حیات کی لمبی دوڑ طے کر لیتا ہے۔ بے حس دل والے بت بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ زمانے کے ہاتھوں کھلونہ بن جاتے ہیں۔'' ماڈل گرل مجھے تکنے لگی۔

''تم تصویر بناؤ۔''

اب اس کی آواز میں بے چینی تھی، اضطراب تھا، کشمکش تھی۔ وہ وقت کے ہاتھوں بت بنی ہوئی ماڈل گرل تھی۔ صرف ماڈل گرل۔ میں نے ہاتھ میں پنسل سنبھالی۔ کاغذ پر میرا ہاتھ تیزی کے ساتھ چلنے لگا۔

''تمہارا نام؟''

''ماڈل گرل۔''

''لیکن جب ماڈل گرل کے قالب سے آزاد ہوتی ہو تب تمہاری نام کیا ہوتا ہے؟''

''وہ نام'' وہ مسکرائی ''آشا......جس کی ساری زندگی نراشا کا شاہکار بن کے رہ گئی ہے۔''

''یہ سوچ [illegible] ہے۔ انسان خود احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اپنی دماغی الجھنوں سے [illegible] جال تیار کر لیتا ہے کہ خود کو اس جال میں بے بس اور بے کس پاتا ہے۔''

وہ خاموش رہی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ میں بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ مگر سوچ کے زاویئے مختلف تھے۔ زندہ رہنے کے مختلف انداز تھے۔

مادیت نے ہماری زندگی میں زہر بھر دیا ہے۔ وقت کی غلامی نے زندگی سے آرام ختم کر دیا ہے۔ زندگی کی حرارت میں سردی بھر دی ہے۔ ذہن غلام، سوچ غلام، زندگی غلام سب مادیت کے غلام بن گئے ہیں۔

لیکن ...... میں کب تک سوچتا رہوں گا۔ میں نے ایک دفعہ پھر پنسل اٹھائی۔ اور تصویر بنانے میں محو ہوا۔ لیکن ہاتھ قابو سے باہر۔ خود بخود کاغذ پر لکیریں کھینچتے جا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر میرا ہاتھ پرایا کیوں بن گیا۔ اور پھر ایک ایسی تصویر بنی جسکا تصور تک میرے ذہن میں نہیں تھا۔ میں نے آشا سے کہا۔

''تصویر نہیں بن سکتی۔ تم جا سکتی ہو۔''

میں نے تصویر پھاڑنے کے لیے اٹھائی۔ آشا نے میرا خیال پڑھ کر کہا۔

''تم تصویر نہیں پھاڑ سکتے۔''

میں نے اس کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''تم پیسے لو اور جاؤ۔''

''میں تصویر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''تصویر نہیں بنی۔''

''جھوٹ بولتے ہو۔''

''ہاں...... ہاں میں جھوٹ بولتا ہوں'' میں چیخ پڑا۔

''لیکن مجھے یہ جھوٹ بولنے دو۔ یہ جھوٹ اس تلخ سچائی سے بہتر ہے جو دل کو ٹھیس لگا دے۔''

آشا تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر میرے ہاتھ سے تصویر لے کر بڑبڑائی۔
''میرے جسم پر کوئی کپڑا نہیں۔ میں ننگی ہو گئی۔ لیکن...... کیوں...... کیوں تمہارے قلم نے مجھے ننگا کیا۔ برہنہ کیا...... بتاؤ؟''
میں بوکھلا گیا۔ کوئی جواب نہ بن پڑا۔
''مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں نے لاکھ چاہا کہ قلم کو لگام دوں۔ قبضہ میں رکھوں۔ لیکن وہ بے قابو ہو گیا۔ میرے اختیار میں نہیں رہا۔''
وہ سوچ میں کھو گئی۔ میں اپنی حکمت پر نادم تھا۔ قلم دھوکہ دے گیا۔ حقیقت پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی۔ ہزار اس کو بہکاؤ۔ مگر بہک نہیں سکتی۔ میں اس سوچ میں محو تھا۔
''اب...... اب میں کیا کروں؟''
آشا کی آواز آئی۔
''مجھے برہنہ ہونے سے بچاؤ۔''
میں نے طنزیہ آواز میں کہا۔
''محبت پر تمہیں یقین نہیں ہے۔''
آشا نے مایوس آواز میں کہا۔ ''لیکن......!''
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تم تو کب کی ننگی ہو گئی؟''
اب آشا نے اعتماد بھری آواز میں کہا۔
''لیکن تمہارے دل میں محبت ہے نا...... تم...... فنکار ہو...... نا۔''
میں کچھ کہہ نہ سکا۔ بطور اعتراف میرا سر جھک گیا۔ پھر اس کے ہاتھ سے تصویر لی...... اور...... اب تصویر برہنہ نہیں رہ سکتی تھی۔

آشوب آگہی

عقل کو بھی تلوار سے ٹکڑے کردو۔ اپنے ہر حساس لمحے کو پھانسی پر چڑھا دو۔ تب پیار کر پاؤ گے۔

لالی ایک اچھی لڑکی ہے۔ میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی تھی۔ لیکن دل کیوں ہمدردی کے لفظ پر اچنبھا میں پڑ جاتا ہے۔ یہ بے ہودہ لفظ ہے۔ غرض کے لبادے میں یہ لفظ الٹے ٹیڑھے معنی لیے ہوئی خنجر کا کام کرتا ہے۔

اور جب کوئی پی. ایچ. ڈی اپنی ناک بھوں کو نفرت سے ایسے سکوڑ لیتا ہے جیسے دوسرے لمحے قیامت آنے والی ہے کیونکہ اس کے لیے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس آدمی قیامت ہے۔ وہ اپنی بغل والی سیٹ پر بازو لہرا کے قبضہ کرتا ہے تاکہ وہ قیامت اس کو اپنی گرفت میں نہ لے لے۔ ایسے لمحے مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ پھر.......پھر ایسے ہی لمحے مجھے ''لالی'' کی یاد آتی ہے۔

وہ کسی آئینہ میں اپنی صورت دیکھنے کی سعی کرتی ہوگی۔

☆☆☆

اخبار والا چیخ رہا تھا۔

''ہندوستانی نے ہندوستان کے جھنڈے کو جلا دیا۔''

میں اپنی سیٹ سے کھڑا ہوا۔ جھنڈے کو ڈھونڈا۔ آگ کو دیکھا۔ ہندوستان کی بازیافتی میں مگن ہوا لیکن وہاں صرف ایک چیخ تھی۔

''ہندوستانی نے ہندوستان کے جھنڈے کو جلا دیا۔''

مگر لالی ایک اچھی لڑکی ہے۔ میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ اس کو میری کہانیاں بہت پسند ہیں۔ اس لیے مجھے اس سے بہت نفرت ہے۔

ہاں ذہین ہونا اچھی بات نہیں ہے، خطرناک ہے۔ اس لیے کچھ لوگ مر جاتے ہیں۔ ہر ایک جس کو آج پاگل...... پاگل کہہ کے پکارتا ہے۔ جانتے ہو وہ کل کیا تھا کوئی نہیں جاننا چاہتا ہے کوئی جان بھی نہیں پائے گا...... چھوڑ دو۔

☆☆☆

برقعہ پوش عورت اپنی دائیں انگلی میں قیمتی انگوٹھی پہنے اپنے ناخنوں کی پالش کو تکتی ہے اور جب میری نظر اس کی نظر سے الجھ جاتی ہے۔ تو اس ہاتھ کا برقعہ میں بند ہو جاتا ہے۔

کوئی کہتا ہے۔

''رسومات جھوٹے، تصورات جھوٹے...... ہم جھوٹے...... تم جھوٹے۔''

برقعہ پوش عورت فوراً اپنے ہاتھ کے پالش کیے ہوئے انگوٹھے کے ناخن کو سر راہ نکالتی ہے۔

میں سر تھام کے رہ گیا۔

''لالی تم جھوٹی ہو۔ تمہارا نام لالی نہیں ہے۔ ہاں مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا کیا نام ہے۔ تمہارا نام غوث النساء ہے۔ جھوٹی...... مجھے تمہارے اس جھوٹ پر کبھی کبھی پیار آتا ہے۔''

لڑکی کہتی ہے۔

''وقت سے پہلے تم نکل پڑے۔''

''میں وقت سے پہلے نکلتا ہوں۔''

''تم جو پڑھتے ہو...... لکھتے ہو...... اس لیے......!''

میں جملہ کاٹ کے لکھتا ہوں۔

''صرف لکھتا ہوں۔''

☆☆☆

''مشینوں کو لاؤ۔ آدمیوں کو نکالو۔ آدمی آدمی نہیں رہے۔ مشینیں کام کرتی ہیں۔ آدمی

مشین نہیں بن سکتا۔ ترقی کی رفتار بدلنی ہوگی...... بدل دو۔"

اقتصادیات کے طالب علم نے دوسرے اقتصادیات کے طالب علم کو سمجھایا۔

میں [illegible] پڑ جاتا ہوں۔

قد[illegible] ہیں...... بدلنے دو۔

[illegible] کریں۔

آ[illegible] یں۔

لالی [illegible] کہتی ہیں۔

"تم [illegible] ے جھوٹ پر پیار نہیں آنا چاہیے۔ پیار بری بلا ہے۔ آگ ہے۔ طوفان ہے۔ پیار کی بیڑی سے کوئی آزاد نہیں ہو پاتا۔"

"نہیں...... نہیں...... میں تم سے پیار نہیں کرتا۔"

☆☆☆

سادھوؤں نے راجدھانی میں جلوس نکالا۔ سادھو اور جلوس۔ یہ لوگ کب سے دنیا دار بن گئے۔

اچھا ہوگا ہم سادھو بن جائیں۔

اف...... انتشار مت پھیلاؤ۔ الجھو مت۔

جذباتی بنو۔

تب لالی یا غوث النساء یا کوئی اور آ کے میرے کان میں کہہ دیتا ہے۔

"عقل کو زہریلی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اپنے ہر حساس لمحے کو پھانسی پر چڑھا دو۔ تب پیار کر پاؤ گے۔"

جدا جدا راستے

جو آپ مرے وہ کیوں دوسرے کے مرنے پر روئے۔ جو آپ لہو سے اپنے کو دھوتا رہے وہ کیوں دوسروں کا لہو دیکھ کر تڑپے۔ شور اور ہنگاموں سے ہم بہت دور چلے گئے۔ رشتے ضروری ہیں لیکن دنیاداری کی باتیں اب بھی ذہن کو چھو لیتی ہیں۔ ایک ایسی آواز کانوں تک آئی۔

''کہاں جانا ہے بابو؟''

''کہاں لے جاؤ گے۔''

''جہاں تک یہ بس جائے گی۔''

''وہاں تک لے جاؤ۔''

''۲۰/روپئے۔''

''ہاں بیس روپئے۔''

روپئے کنڈکٹر کے پاس چلے گئے۔ لیکن زنجیر ختم نہیں ہوئی۔ میری بغل میں بیٹھے ہوئے پنڈت نے کہا۔

''کچھ ٹوٹا ہے۔''

''ٹوٹا ہے؟''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ جیسے اخلاق کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ بوڑھے نے کہا۔

''اچھی بات نہیں ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پنڈت نے بوڑھے سے کہا۔

''اچھے تھے وہ پرانے وقت جب پانچ آنے میں گوشت ایک پاؤ ملتا تھا۔''

میں نے دوسری سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا۔

''زنجیر [illegible]''

وہ اپنے گھر کے سامان کو سنبھالتا۔ لیکن وہ گر پڑتا۔ کب تک آدمی چیزوں کو سنبھالتا ہے۔ خود کو سنبھالے یا حالات کو۔ بوڑھے نے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔

''تب کوئی مذہب نہیں تھا۔ ہندو نہیں تھا، مسلمان نہیں تھا۔ انسان تھے صرف انسان۔''

اب تو یہ خیالوں کی زنجیر تھی جو ٹوٹ گئی۔ لیکن اب اس کے پرستار نہ رہو۔ بدل جاؤ۔

پنڈت نے کہا۔

''تم چپ کیوں ہو؟''

''بزرگوں کے سامنے زبان بند رکھنا سیکھ لیا ہے۔''

اخلاق کی زنجیر جڑ گئی۔ میری طرف وہ تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔ روحانی قدروں کا زمانہ نہیں رہا۔ کوئی وقت کا حاتم بھی نہ رہا۔ کسی لیلیٰ کی ضرورت نہ رہی۔ نہ صحرا کی تلاش ہی رہی۔ پھر بوڑھے کو جنگل کیوں پیارے ہیں۔ یہ زنجیر اچھی نہیں ہے۔

بوڑھے نے مجھے ٹوک دیا۔

''کچھ تو بولو۔''

''کیا بولوں؟''

''جو تمہارے ذہن میں ہے۔''

''خدا میرے دل میں ہے۔''

''یہ سوال نہیں ہے۔''

میں زنجیروں کے گھیراؤ کو بھول گیا۔ ہاتھ میں لی ہوئی جاسوسی ناول کو بھول گیا۔ خالی الذہن تھا۔ پھر بھی ذہن میں کچھ پڑا۔ جو فوراً لب پر آ گیا۔

''انا الحق......بتاؤ.....انا الحق.....کا معنی.....''

وہ کھو گیا۔ بوڑھے کو کھونے دو.....اپنی ہی زنجیر میں الجھنے دو۔ میں نے بوڑھے کو

پکڑا۔

''تم جھوٹے ہو۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم بھی سچ نہیں ہو۔''

میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

''جواب دو۔''

''میرے پاس جواب نہیں ہے۔''

''منزل آرہی ہے۔''

''تمہاری منزل بہت دور ہے۔''

میری منزل کہاں ہے......میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ سوچ کی زنجیر ٹوٹتی کیوں نہیں۔
حضرت بل آ گیا۔ میرے تھکے ہوئے قدم گاڑی سے باہر آ گئے۔ بوڑھے نے
پکارا۔

''اجنبی ادھر آؤ۔''

میں اس کے پاس گیا۔ اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''نہیں جانتا۔''

''چھوڑ دو۔ سب کو چھوڑ دو۔ میرے ساتھ آؤ ان پہاڑوں میں۔ وہاں قدرت ہے
قدرت۔

''تمہیں وہاں جانا ہوگا۔''

میں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں نہیں جا سکتا۔ زنجیریں ہیں۔ یہ زنجیریں بڑی مضبوط ہیں۔''

بوڑھے نے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''جاؤ...... جاؤ۔ تمہاری جگہ ہمارے پاس کبھی نہیں ہے۔ اپنی زنجیروں کو سنبھالے رہو۔ تمہاری یہی زنجیریں پھانسی کا پھندا بن جائیں گی۔''

وہ اپنے راستے گیا میں اپنے راستے۔ پھر کبھی ملیں گے۔ اگر کبھی ملیں گے تو کیا ایک دوسرے کو پہچان پائیں گے

طوفان

ڈونگہ بابا ڈیمپ کے گھاٹ کو چھوڑ کر نچہ بل کی طرف روانہ ہوا۔ ملاح کی رنگین آواز فضاؤں میں بکھر گئی۔ وہ ایک کشمیری گیت گا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ڈونگہ نچہ بل کے گھاٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ دو آدمی قالین، کھانے کا سامان اور بستہ لیے ڈونگے کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

''غفار اگر ہم یہاں سے دن کے چار بجے روانہ ہوں گے تو حضرت بل کتنے بجے تک پہنچیں گے۔''

''رات کے گیارہ بجے تک تو پہنچ جانا چاہیے۔ اب آپ لوگ جلد ڈونگے میں آ جایئے۔''

''تھوڑی دیر میں ہی سب آ جائیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ دونوں واپس چلے گئے۔

ملاح غفار کی عمر تیس برس تھی۔ والدین نے اپنے پیچھے اس کے لیے ایک ڈونگہ چھوڑ دیا تھا۔ جس کی چھت کو مرمت کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے دس پندرہ ہزار روپئے درکار تھے۔ جو اب تک وہ حاصل نہ کر سکا۔ اس بار امید تھی کہ ان گراہکوں سے اس کو اتنی رقم مل جائے گی۔ دو سال پہلے اس کی شادی اپنے چاچا کی بیٹی زینب سے ہوئی تھی۔ لیکن کوئی بچہ نہ تھا۔ زینب سوچ رہی تھی کہ درگاہ شریف میں بطور نیاز کچھ رقم دے تو اس کے یہاں بچہ پیدا ہوگا۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ صمد شاہ گھر میں داخل ہوا۔ غفار نے کہا۔

''صمد شاہ خیریت تو ہے۔''

"صمد شاہ خیریت تو ہے۔" اس نے دوسری بار جملہ دہرایا۔

"بھئی ان لوگوں نے ڈل آنے کے لیے مجبور کیا۔ میرا بیٹا سخت بیمار ہے۔ میں اس کو اس حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اب خدا ہی خیر کرے۔"

"[illegible] خدا [illegible]"

صمد شاہ شہر [illegible] کھانا بنانے والا تھا۔ لذیذ کھانا بنانے میں اسے درجہ اول کا سرٹیفکیٹ ملا [illegible]

[illegible] بجے آدمیوں [illegible] ایک گروہ نچہ بل گھاٹ پر آگیا۔ گروہ کے آگے آگے چالیس سال کی عمر کا ایک آدمی تھا [illegible] کا نام محمد عثمان تھا۔ وہ ایک اسکول ہیڈ ماسٹر تھا۔ اب تک شادی نہ ہوئی تھی۔ اس نے ایک استانی سے آنکھ لڑائی۔ دو تین دن اکٹھے نشاط اور شالیمار میں عہد و پیمان کے لمبے چوڑے وعدے کیے۔ لیکن استانی ہیڈ ماسٹر کو چھوڑ کر ایک امیر زادے کی ہوگئی۔ ہیڈ ماسٹر نے کسی بھی عورت کو اپنے قریب نہ لانے کی قسم کھائی۔ شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اب تو صرف اس کو اسکول کی معمولی معمولی باتوں کی فکر رہتی تھی۔

ہیڈ ماسٹر نے ڈونگے میں سوار ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے ڈر اس بات کا ہے کہیں وہ ماسٹر سلام لڑکوں کو چھٹی نہ دے دے۔ بخدا کام چور آدمی ہے۔"

ان ہی میں سے ایک آدمی نے جس کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس سال تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہنے لگا۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب اس وقت اسکول کی باتوں کو بھول جائیے۔"

نوجوان آدمی کا نام رندھیر تھا۔ رندھیر نے دو مہینے پہلے ایم.اے فائنل کا امتحان دیا تھا۔ وہ غریب والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کو امید تھی کہ اگر بیٹا امتحان میں پاس ہوا تو کسی مقامی کالج میں لیکچرار بن جائے گا۔ رندھیر بھی چاہتا تھا کہ وہ بھی بوڑھے ماں باپ کے کسی کام آئے۔ ہیڈ ماسٹر نے رندھیر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"رندھیر کہاں کھو گئے؟ شاید تمہیں رزلٹ کی فکر لاحق ہے۔ فیل اگر کوئی ہوگا تو وہ میں

ہوں گا۔تم ضرور پاس ہو جاؤ گے۔"

ہیڈ ماسٹر زندہ دل آدمی تھا۔اسی زندہ دلی کی وجہ سے وہ ہر جلسہ مجلس میں چھا جاتا تھا۔اس کی یہ باتیں سن کر سب ہی لوگ ہنس پڑے۔ملاح غفار نے اپنے دونگے کا رخ ڈل جھیل کی جانب کیا۔ہیڈ ماسٹر کے گھریلو نوکر عبداللہ نے ان کے سامنے چائے رکھی۔عبداللہ شوپیاں کا رہنے والا تھا۔گذشتہ سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے کھیتوں میں کوئی فصل نہ ہوئی۔اس لیے وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس پانچ ہزار روپئے کی نوکری کرنے لگا۔ان ہی سے اس کے گھر کے تین افراد اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ہیڈ ماسٹر ڈل کی سیر کو نکلا تھا۔اس لیے اپنے گاؤں آج تنخواہ روانہ نہ کرسکا۔چائے پینے کے بعد ہیڈ ماسٹر نے عبداللہ سے کہا۔

"عبداللہ ذرا تاش ادھر لا۔"

تاش آ گیا۔وہ تاش بانٹنے لگا۔فلاش کا پہلا راؤنڈ ختم ہوا۔ہیڈ ماسٹر نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا۔

"قیوم تم اس جوئے میں بھی تجارت کی ہنر بازیاں چلاتے ہو،اس لیے جیتتے ہو۔"

قیوم قالینوں کا ایک مشہور تاجر تھا۔قیوم سنز کا نام کشمیر میں آنے والے ہر بیرونی سیاح کی زبان پر ہوتا تھا۔کہتے ہیں کہ مجال تھی کوئی سیاح قالین خریدے بغیر اس کی دوکان سے باہر نکل جائے۔جوا کھیلنے میں بھی قیوم ماہر مانا جاتا تھا۔اس وقت اس کے ہاتھ میں تین بادشاہ تھے۔

"احمد شاہ آگے بڑھو۔" احمد شاہ نے کانپتے ہوئے میدان میں دس روپئے ڈال کر کہا

"شو۔"

قیوم نے تین بادشاہ ترتیب کے ساتھ اس کے سامنے رکھے اور روپیوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی احمد شاہ سونار نے وہ چوڑیاں تیار نہیں کیں۔"

"ابھی تیار نہیں ہوئیں۔لیکن دینے کا وعدہ کیا ہے۔مجھے کل چار چناری سے شہر دو تین گھنٹے کے لیے جانا ہی پڑے گا۔"

احمد شاہ نے جب بی.اے پاس کیا تو نوکری ڈھونڈنے نکلا۔ایک دفتر سے دوسرے دوسرے سے تیسرے۔لیکن سب جگہ ایک ہی جواب ملا.No vacancy"

مایوس ہوکر اس نے ایک غیر سرکاری کارخانے کا رخ کیا یہاں پر اس کو ۵/ہزار روپئے کی نوکری ملی۔اس کی ایک ہی بہن تھی۔چار مہینے پہلے اس نے اس کی منگنی کی تھی۔بے چارے نے دو [illegible] سال کی محنت کے بعد کچھ پیسے جمع کیے تھے اوران پیسوں سے بہن کے لیے آج کل زیورات [illegible] انتظام ہوگئی تھی۔صدیق چیخ پڑا۔

"ارے بھائی احمد شاہ کھانا تیار ہوا۔"

"ابھی نہیں۔"

"اف.....اف پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔" صدیق نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔سب لوگ یہ سن کر ہنس پڑے۔ہیڈ ماسٹر صاحب سے رہا نہ گیا۔

"صدیق تمہیں تو ہر جگہ پیٹ کی فکر رہتی ہے۔"

"کریں کیا؟ آدمی سب کچھ پیٹ کے لیے ہی تو کرتا ہے۔"

"خاص کر تم۔"

سب دوبارہ ہنس پڑے۔صدیق کوئی کام نہیں کرتا تھا۔اس نے سیر وتفریح اور پیٹ کے سوا کچھ حاصل ہی نہ کیا تھا۔اس کو کام کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔آبائی میراث بہت تھی۔شوپیاں کے علاقے میں دوسو کنال لمبا کھیت تھا۔رندھیر نے تاش کے پتے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"صدیق میں نے سنا ہے کہ سرکار چکداروں سے بہت جلد زمین لے رہی ہے۔"

صدیق نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

"یہی فکر تو مجھے بھی ہے کہ کہیں سچ مچ سرکار زمین کاشت کرنے والوں کو نہ دے دے۔اسی فکر میں تو مجھے جلد بھوک لگ جاتی ہے۔"

احمد شاہ نے کھانا تیار کیا۔کھانا لگ گیا۔ڈونگہ اس وقت ڈل کٹوال میں تھا۔سب کھانا کھانے میں مصروف تھے۔رندھیر نے گوشت کے ایک ٹکڑے کو منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''بہتر یہ ہے کہ رات چار چناری میں گزاریں۔ وہاں پر باتھ روم بھی ہیں۔''

ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ ہم شالیمار جائیں گے۔ لیکن چار چناری زیادہ اچھا رہے گا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' قیوم نے ہیڈ ماسٹر کی بات کی تائید کرتے ہوئے ڈونگے کی کھڑکی سے آسمان کی طرف نظر ڈالی اور کہا۔

''لیکن آسمان پر بادل پھیل رہے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں بارش نہ ہو۔ اس لیے غفار سے کہو کہ جلدی ڈونگے کو چار چناری لے جائے۔''

اچانک بادل تیزی سے گرجنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ قدرت زمین کا دل دہلانے پر آمادہ تھی۔ ان کا ڈونگہ ڈل جھیل کے بیچ میں تھا۔ بارش ہونے لگی۔ اچانک ایسی ہوا چلنے لگی کہ سب کی زبان سے اکٹھے نکلا۔

''طوفان''

طوفان اپنی گود میں گئی زندگیوں کو سمیٹ لیتا ہے۔ ڈونگے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کے چہروں کا رنگ فق ہو گیا۔ احمد شاہ کہنے لگا۔

''مجھے صبح بہن کی چوڑیاں لینے جانا تھا۔ لیکن صبح تک نہ جانے کیا حال ہوگا؟''

رندھیر نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''تمہیں تو سونے کی چوڑیوں کا غم ہے۔ چوڑیاں تو آ ہی جائیں گی لیکن میں ایم. اے میں پاس ہوں یا فیل ہوں، یہ کون بتائے گا۔''

ہیڈ ماسٹر نے رندھیر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''رندھیر کیا ہوا تمہیں؟ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ طوفان خود بخود ٹل جائے گا۔ لیکن مجھے فکر اس بات کی ہے کہ کہیں اسکول کے چپراسی نے اسکول کے کمروں کی کھڑکیاں کھلی نہ رکھی ہوں۔ ان کے شیشے ٹوٹ جائیں گے۔''

صدیق نے زور کا قہقہہ لگایا۔

''تم سب ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے سوچ رہے ہو۔ ارے میرا حال دیکھو۔

میری تو ساری چک داری جا رہی ہے۔ قیوم کے ہاتھ میں تاش کے تین پتے تھے۔ اس نے کہا۔

''ارے بھئی [illegible] ور کی سوچتے ہو۔ میرے ہاتھ میں تین اکے ہیں۔ کون ہے جو ان کے ساتھ مقابلہ کر [illegible] ہے۔ طوفان بھی بڑا دھوکے باز نکلا۔ میری اچھی خاصی رقم ڈبو دی۔''

[illegible] باورچی خانے میں داخل ہوا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں صمد شاہ سے کہنے لگا۔

''[illegible] طوفان [illegible] گا بھی یا نہیں۔ مجھے تو کل صبح شالیمار کے ڈاکخانے سے گھر تنخواہ کے روپئے روانہ کرنے تھے۔''

صمد شاہ نے سنجیدہ آواز میں کہا۔

''عبداللہ تمہیں گھر تنخواہ روانہ کرنے کی فکر پڑی ہوئی ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ میرے بیٹے کا کیا حال ہوگا جو کل سے بیمار پڑا ہے۔''

غفار کی بیوی زینب کے ہاتھ میں لمبا چپو تھا۔ وہ بڑبڑائی۔

''مجھے درگاہ میں نیاز چڑھانی ہے۔ تب ہی میرے گھر میں اولاد ہوگی۔''

غفار اپنے دونگے کی چھت دیکھ کر کہنے لگا۔

''لگتا ہے اس طوفان کے ساتھ میری دس پندرہ ہزار کی رقم ڈوب جائے گی اور میں اس سال بھی ڈونگے کی چھت کی مرمت نہیں کرواسکوں گا۔''

لیکن اس طوفان!.......میں بھی اتنے خیالات کا طوفان!!

گھاس کا تنکا

"بہت اونچا کھڑا ہوں۔"

میں نے لمبی سانس لی۔ اونچائی کو دیکھ کر خوف لگتا تھا۔ وہ خوف۔ جو طبیعت میں کمزوری لانے کا باعث بن جاتا ہے۔ میرے دماغ میں یہ خیال آ گیا۔

"کیوں نا میں یہاں سے کود جاؤں۔ پھر میرے جسم کا حلیہ بگڑ جائے گا۔"

لیکن کیوں یہ خیال میرے دماغ میں آیا، کیسے آیا، کیونکر آیا۔ اور کیونکر اس انوکھے خیال سے مجھے چھٹکارا ملے گا۔ کیا میں زندگی کی بے ربط جدو جہد سے تنگ آ گیا ہوں۔ تنگ اور سخت زندگی سے ہمیشہ آدمی عاجز آ جاتا ہے۔ اور عاجز انسان اس منتشر دماغ سے چھٹکارا پانے کے لیے کہیں اور الجھ جاتا ہے۔ تب میری نظر سڑک پر جاتی ہوئی اسکرٹ پہنے جاتی ہوئی دوشیزہ پر پڑی۔ وہ دوشیزہ جس کا شباب بقیہ کپڑوں سے پھوٹ پھوٹ کر یہ تقاضہ کر رہا تھا۔

"اتار لو میرے یہ کپڑے۔ چھٹکارا دلا دو مجھے میرے ان کپڑوں سے۔ میرا حسن بے باک ہو کر نظر شوق سے داد وصول کرنا چاہتا ہے۔"

یہ کل کی عورت نہیں جو چلمن سے باہر اپنا چہرہ بھی نکال لینے کو گناہ سمجھتی تھی۔ ایک ایسا گناہ جو قتل کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ قدریں بدل رہی ہیں۔

قدروں کے ساتھ انسان بدل رہے ہیں۔ تقاضے بدل رہے ہیں اور یہی نئے تقاضے آج کی عورت سے برہنہ ہو جانے کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ اس کی مخالف جنس اس بات کے لیے عورت کا احساس جھنجھوڑتی ہے۔ سماج کے بدلے ہوئے اصول ہر انسان کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ نئی قدروں، نئے اصولوں اور نئے تقاضوں کو اپنائے...... ایسے تقاضے...... ایسے اصول.......

جو چیخ چیخ کر میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ لیکن میں نئے تقاضے اور نئے اصولوں کی الجھنوں میں کیوں پڑا ہوں۔ یہ کہاں مجھے ذہنی کوفت سے نجات دلائیں گے۔ یہ کوفت ہی مجھ میں کیوں پیدا ہوئی۔ [illegible] نیچے اور قدآور مکان منتشر دماغ کو سکون بخش دینے کی جگہ نہیں تھے۔ کپڑ[illegible]...... اور [illegible] کا یہ تصور زندگی کے لیے بارگراں ثابت ہوتا ہے۔ اس بوجھ سے نجات دلا[illegible] کس چیز کی تلاش کر رہا تھا...... ہاں اندھیروں میں نظر آیا...... سرکاری کھ[illegible] دھیمی روشنی آس پاس پھیلا کر کوئی تصویر پیش کر رہا تھا۔ میں چیخ پڑا۔ ''نہیں [illegible]'' وہ انسان تھا...... ایک انسان جو سرکاری روشنی میں مستقبل کے دھاگوں سے [illegible] بن رہا تھا۔ وہ کتاب کے ہر لفظ میں کھو کر کچھ پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سنہرے مستقبل کے جتن میں قدرت کی دی ہوئی روشنی کو اندھیروں میں تبدیل کر رہا تھا۔ پھر وہ کل کسی دفتر میں کلرک بن جائے گا۔ کلرک بن بھی جائے نا...... میں اس سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

مستقبل کی تلاش میں میرے دوست بجلی کے اس کھمبے کے نیچے تمہیں تمہارا سنہرا مستقبل نہیں ملے گا۔ اس دھیمی روشنی کے ساتھ بھیانک اندھیرا ملے گا۔ میں چیخ پڑوں گا ہاں میں چیخ پڑوں گا۔ ''چھوڑ دو اس کھمبے کو...... آؤ...... میرے پاس۔ اتنے اونچے آجاؤ۔ یہاں سے تم اشوکا ہوٹل کی دیو پیکر عمارت دیکھ سکو گے۔ ماضی کا لال قلعہ اور قطب مینار دیکھ سکو گے۔ اونچی اونچی عمارتوں کے ساتھ رنگ برنگی زندگی کی جھلکیاں دیکھ سکو گے۔ چھوڑ دو۔'' میں اپنے بازوؤں کو پھیلا کر اس کو دعوت دوں گا۔ لیکن مجھے افسوس ہوگا جب وہ مجھ سے کہے گا۔

''نیچے آجاؤ...... ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے...... مجھے سنہرے مستقبل کا جھانسہ دے کر مجھ سے میرا ایمان، میرا نصب العین اور میری زندگی چھین لینا چاہتے ہو۔ ان اونچی عمارتوں میں گناہ، نفرت، جھوٹ، ہوس اور فریب بھرے ہوئے ہیں۔ ان عمارتوں کی اینٹوں میں گارا نہیں خون لگا ہوا ہے۔ نیچے آجاؤ...... ورنہ تم اپنے آپ کو کھو دو گے۔''

''نیچے آجاؤں..... لیکن کیسے؟''

لفظ ''کیسے'' سوال بن گیا تھا۔

تارکول والی سیاہ سڑک کو دیکھ کر میری رگ رگ میں دہشت پھیل گئی۔ دہشت اور وحشت دونوں نے ایک ساتھ یلغار کی۔ میں لڑکے کے پاس جانا چاہتا تھا۔

""لیکن کیسے جاؤں؟""

میں ایک مجبور انسان، ایک ایسا انسان جو کبھی قدروں میں الجھا ہوا ہے۔ تو کبھی جذبات کے ہاتھ گرگٹ بنا ہوا ہے۔ کبھی روح کی آواز کے قبضہ میں ہے۔ کبھی ضمیر کے احساس سے ڈرتا ہے۔ بھلا ایک انسان کیسے امن سے رہ سکتا ہے۔ تخریبی عناصر ہر وقت اس کے دماغ میں کام کرتے رہتے ہیں۔ یا تو ایک بے حس جسم ہونا چاہیے۔ جس میں نہ دماغ کی صدا ہو نہ ہی روح کے آتشیں جھونکے۔ ان سب سے بھلا کیسے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ایک ذی ہوش آدمی کو......تب اچانک میرا ذہن پھسل کر اس گھاس کے تنکے پر گیا جو میرے ہاتھ میں تھا۔

""گھاس کا تنکا۔""

میں بڑبڑایا۔ کتنا ہی چھوٹا۔ کتنا ہی پیارا۔ اس کا ریشم جیسا بدن کسی دوشیزہ کے سڈول جسم کی یاد دلاتا تھا۔ لیکن اب تک یہ گھاس کا تنکا میری نظروں سے کیوں بچتا رہا۔ مجھے افسوس ہوا۔ گھاس کا تنکا مجھ سے کہہ رہا تھا۔

""گھاس کا تنکا جو ٹھہرا۔""

دھان کی بالیوں سے آیا ہوا گھاس کا تنکا نہ جانے کیوں میرے ہاتھ میں آ گیا اور کب آ گیا اور جہاں سے میرے ہاتھ میں آیا وہاں تک کیسے چلا آیا۔ میں پھر بڑبڑایا۔

""تو گھاس کا تنکا ہے۔""

جس کے پاس نہ ماضی کا عکس نہ مستقبل کی فکر۔ جو نہ قدروں میں الجھا ہوا ہے نہ رسموں کا غلام ہے۔ جس کے پاس نہ ایمان کا خوف ہے نہ ضمیر کے تلخ تجربے۔ کیونکہ وہ.......

""گھاس کا تنکا ہے۔""

ایک میں انسان ہوں جو قدروں، رسموں کا غلام بن کے اپنے دماغ میں ہر لمحے بٹوارہ کرتا رہتا ہے۔ میں چیخ پڑا۔

""یہ دماغ کا بٹوارہ مجھے گوارہ نہیں، نجات چاہیے۔ مجھے ایسے بٹوارے سے۔ اس

کشمکش سے......اس اضطراب سے۔

پھر آواز آئی۔

''کود جاؤ۔''

میں [illegible] میں پڑ گیا۔ میں پھر خیالوں کے طوفان کی گرفت میں آ گیا۔ کبھی ایک ہاتھ سے اپنے [illegible] کو پکڑتا کبھی دوسرے ہاتھ سے، نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ کون سا ''وہم'' [illegible] دھو[illegible] پڑ گیا تھا۔ اس پریشانی میں گھاس کا تنکا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں چیخ [illegible]۔

''گھاس [illegible] تنکا۔''

وہ گر رہا تھا......گر رہا تھا......میں سوچ رہا تھا۔

''نہ جانے اس گھاس کے تنکے کا کیا حشر ہوگا؟''

''کیا ہوگا؟''

ایک سوال تھا.....لیکن مجھے بہت جلد جواب ملا۔ گھاس کا تنکا صحیح و سالم تارکول کی سڑک پر لیٹ گیا۔ اس کے جسم کے پرخچے نہیں اڑے۔ وہ مرا نہیں۔ اس کا وجود ختم نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ انسان نہیں تھا۔ لیکن اسی وقت وہ گھاس کا تنکا ایک سفید فام انسان کے پاؤں کے نیچے آ کر مر گیا۔ ہاں ایک انسان کے پاؤں نے گھاس کے تنکے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انسان کب کسی کا وجود برداشت کرتا ہے۔

گھر سے کالج تک

گھر سے کالج تک کا راستہ کتنا چھوٹا ہے؟ کتنا لمبا ہے؟ کتنا اچھا ہے؟ کتنا برا ہے۔نہ
نے گھر سے کالج تک راستے پر چلتے ہوئے دماغ میں کیا کیا خیالات آتے ہیں۔ دماغ
یالات کا گہوارہ، خیالات کو دماغ میں آنے سے کون روک سکتا ہے۔ ہر دن کی طرح صبح منہ
ھ دھوکر بالوں پر تیزی سے کنگھی کر صاف قمیص پہن کے، جوتوں کو پالش سے چمکا کر کالج
انے کے لیے تیار ہوا۔ ماں سے پچاس روپئے یہ کہہ کر وصولا۔

''ماں آج شدت کی گرمی ہے۔ایسی گرمی میں دو تین بار لیمن Lemon کا پانی پینا
ڑتا ہے۔مجھے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔تو نے پڑھا ہوتا تو سمجھتی کہ علم کیا بلا ہے۔''

ماں نے گہری سانس لی۔میں نے اپنی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ یہ ساڑھے بارہ روپئے
ی گھڑی میرے باپ کو اس کے باپ نے میٹرک پاس کرنے کی خوشی میں دی تھی۔ میں نے
ب میٹرک پاس کیا تھا تو ابا جان سے ایک موٹر سائیکل لانے کا مطالبہ کیا تھا۔لیکن افلاس سے
م کب آزاد تھے۔ جو وہ موٹر سائیکل لاتے۔انہوں نے یہ کہہ کر پرانی گھڑی دے دی کہ ایک تو
بزرگوں کی نشانی ہے۔دوسرا یہ وقت یاد دلاتی رہے گی جو ایک طالب علم کے لیے بہت ضروری
ہے۔ پرانی گھڑی کو پرانے انداز سے دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ ابھی کلاس شروع ہونے میں
رے دو گھنٹے باقی ہیں۔اس لیے دل ہی دل میں گھر سے کالج تک پیدل جانے کا ارادہ کیا۔
ستے میں نکو اور اس کے دو ساتھی ملے۔باپ نے نکو کا نام ناصر رکھا تھا۔لیکن جوا کھیلنے میں ایسا
نام ہوا کہ اس کا نام بگڑتے بگڑتے نکو رہ گیا۔

نکو مجھ سے اس لیے ڈرتا تھا کہ میں اس کے تاش کے پتوں کے راز سے واقف ہو گیا

تھا۔ میں اس کے قریب آ گیا۔

’’کیوں استاد کیا ہو رہا ہے؟‘‘

’’جو ہو رہا ہے ہونے دو۔‘‘

میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

’’[illegible]‘‘

’’[illegible] میں نے پوچھا ’’ابھی بولی شروع نہیں ہوئی ہے۔‘‘

اس کے ساتھ ہی استاد کی زبان تیزی سے چلنے لگی۔

’’قسمت آزماؤ...... دس کے بیس...... بیس کے تیس۔‘‘

میں سوچنے لگا کہ استاد کو اتنی جلدی جنون کیوں آ گیا۔ سامنے دیکھا تو دو کسان آ رہے تھے۔ بے چارے تاش کے تین پتے ’’غلام، بیگم، بادشاہ‘‘ کو قسمت کا کھیل سمجھ کر اپنی پونجی لٹا بیٹھے۔ میں نے نکو سے کہا۔

’’استاد بڑا ہاتھ مارا۔‘‘

’’ہاں مارا۔‘‘

اس نے میرے ہاتھ میں پچاس روپے رکھ دیے۔ اور پھر اپنا راگ الاپنے لگا

’’قسمت کا کھیل۔‘‘

استاد کے ساتھ بک بک کے بعد تازگی کی ضرورت تھی۔ میں سامنے کے چائے خانے میں گھس گیا۔ دقیانوسی قسم کا چائے خانہ تھا۔ جہاں ۱۰ روپے میں ایک چائے ملتی تھی۔ بیرا آیا جو ہوٹل کا مالک، منیجر سب کچھ تھا۔

’’ایک چائے جناب۔‘‘

’’دس روپے۔‘‘

’’دس روپے۔‘‘

’’ہاں اور یہاں ادھار نہیں ملتا۔‘‘

’’میں بھی ادھار نہیں لیتا۔‘‘

''تم کالج کے لڑکوں کو خدا ہی سمجھے۔''

''ہم نے کیا بگاڑا تیرا۔''

''کچھ نہیں۔'' اس نے نرم لہجہ میں کہا۔ ''معاف کر دو۔''

شاید اس نے سوچا۔

''اب تم سے کون جھگڑا مول لے۔ جھگڑا مول لیا تو کالج کے لڑکے نعرہ دیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ میرا جینا دوبھر ہو جائے گا۔''

میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

چائے کی چسکی چل رہی تھی کہ ایک آدمی آیا۔

''بھائی صاحب آپ کالج جاتے ہیں۔''

''ہاں''

''تو میرا ایک کام کر دیجیے۔ مہربانی ہو گی۔''

''کہو! کہو۔''

''یہ خط پڑھ دیجیے۔''

میں نے چائے کی پیالی نیچے رکھی اور خط پڑھنے لگا۔

''ابا جی۔''

مدت ہوئی آپ کو شہر گئے ہوئے مگر اب تک خط نہ ملا۔ یہاں پر سب لوگ خیریت سے ہیں اور آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ آج ساہوکار صبح گھر آیا تھا۔ کہہ گیا ہے کہ بیس دن میں بیش ہزار نہ ملے تو عدالت سے اجازت لا کے زمین پر قبضہ کروں گا۔ ابا جی کچھ کیجیے اور زمین کو بچا لیجیے۔

تمہارا بیٹا

عبدالقیوم

میں نے دیکھا کہ کسان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''بابو میں اب تک صرف ۵ ہزار جمع کر سکا۔ دس دن میں ۱۵ ہزار کہاں سے جمع ہوں

گے۔ کیا ہو سکتا ہے۔ کیسے.....''

یہ کہتے ہوئے [illegible] چلا گیا۔ میرے لبوں سے نکلا۔

'' [illegible] چار!''

[illegible] مجھے [illegible] بلا رہی تھی۔ دس روپے دے کے چائے خانے سے باہر آیا۔

اسلم اور اکبر [illegible] سے [illegible] ئے آئے۔

'' [illegible] کت [illegible] ذرا ٹھہرو۔''

'' [illegible] تم نے [illegible]

'' کیا؟''

''جناب یہ بتایئے تین مہینے کے بعد ہی امتحان لینا سراسر زیادتی ہے نا۔ اس ظلم کے خلاف ہڑتال ہونی چاہیے۔''

میں نے ان دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اس میں برائی ہی کیا ہے۔''

''یہ ظلم ہے اور اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانی ہوگی۔''

اب میں نے بھی تائید میں گردن لمبی کی۔ گرلز کالج آ گیا۔ اسلم اپنی ہڑتال بھول گیا۔ ہم تینوں سب کچھ بھول گئے اور ہمارے دماغ میں صرف بھڑکیلے، چمکیلے فراک ڈوپٹے گھومنے لگے۔ اسلم نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''اس لڑکی کو جانتے ہو۔ وہ سرخ والی۔''

''جس کی بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔''

''ہاں..... ہاں......اس کا نام سریتا ہے۔ یہ ایسے لڑکے پر مرتی ہے.....کیا کہوں یار......وہ لنگور ہے اور یہ حور۔ بھئی مجھے اس کی قسمت پر رشک آتا ہے۔''

اکبر نے دوسری طرف ایک سبز ڈوپٹے والی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ لڑکی ہے نا۔ اس کا نام زبیدہ ہے۔ اس کا Affair اپنے رشتے دار کے ساتھ ہے۔''

ایک کرسچن لڑکی ننگی باہیں ہلاتے ہوئے گزری۔ اکبر نے اپنے منہ پر زبان پھیرتے

ہوئے کہا۔

''اس کی باہیں۔''

''بے وقوف مت بنو۔''

اکبر سے یہ کہتے ہوئے میں نے لڑکی کی طرف آنکھ ماری۔ اس کے چہرے پر تبسم پھیل گیا۔ میں نے کہا۔

''آزاد خیال لڑکی۔''

ایک لڑکا سائیکل پر دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا۔

''ارے تم لوگ یہاں ہو۔ ہسٹری کا گھنٹہ شروع ہو گیا۔''

ہم سب کچھ بھول گئے۔ دوڑتے ہوئے کلاس میں پہنچے۔ پروفیسر بورڈ پر لکھ رہا تھا۔

''ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی..... لارڈ رسن..... کرزن..... وہاں..... نہیں..... سریتا کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں..... نہیں..... نکو کے تاش کے پتے..... نہیں..... وہاں زبیدہ کا سبز ڈوپٹہ لہرا رہا تھا..... نہیں..... وہاں پر کسان کے ۵ ہزار تھے..... نہیں..... وہاں پر کرسچن لڑکی کی سفید باہیں تھیں..... نہیں..... وہاں کچھ تھا..... کچھ بھی نہیں تھا۔

یہ دوڑ

وہ اپنے مکان...... جو پرانے طرز کا ایک قدیمی مکان تھا، میں داخل ہوا۔ جو آج کے جدید سماج میں مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اسی کی ایک پرانی کھڑکی جو سڑک پر کھلتی تھی، سے وہ ہر دن کے حالات پر نظر ڈالتا تھا۔ آج جب وہ کالج سے واپس آیا اور کھڑکی پر بیٹھا تو اس کو ہسٹری پیریڈ کا وہ واقعہ یاد آیا۔ جواب تک اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ ہسٹری کے پروفیسر نے کہا تھا ''اکبر مجھے پورا اعتماد ہے کہ تم یہ دوڑ جیت لو گے......'' نہ جانے پروفیسر کیا کہتا رہا۔ اکبر پوچھنا چاہتا تھا۔

''کس دوڑ کے بارے میں آپ کہہ رہے ہیں سر۔''

یہ ایک سوال تھا۔ جس کا وہ جواب چاہتا تھا۔ دنیا ایک دوڑ میں شامل ہوئی تھی۔ جہاں تباہی کے آثار ہر لمحے کے بعد قریب سے قریب تر نظر آ رہے تھے۔ کیا اس کا پروفیسر چاہتا تھا کہ وہ ایک ایسی دوڑ میں شامل ہو جائے..... ہاں ایک ایسی دوڑ جو کائنات کو تباہی کے سمندر میں غرق کر دے۔ نہیں...... نہیں۔ وہ کالج کی ایک دوڑ تھی جس میں مقرر کردہ فاصلہ طے کرنا تھا۔ تب ہی وہ دوڑ جیت سکتا تھا۔

''فاصلہ...... دوڑ۔''

''کون سا فاصلہ...... کون سی دوڑ۔''

سڑک پر چلتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ کر اس کے دل نے پھر یہ سوال کیا۔ وہ لڑکیاں جو کل تک اینٹ اور چونے سے بنی ہوئی دیواروں میں رہتی تھی۔ جن کے اندرون کو سورج کی کرنیں بھی نہیں چھو سکتی تھیں۔ جن کا چہرہ سات پردوں میں چھپا رہتا تھا۔ ایک ایسی دوڑ میں شریک

تھیں جو جذبات میں ہلچل مچا رہی تھی جس کو فیشن کی دوڑ کہتے ہیں۔ یہ دوڑ ان کو کہاں لے

جائے گی۔ پتھر کے زمانے تک......ان کی ننگی بانہیں اور ٹانگیں دعوت گناہ کے لیے انسان کو اکسا رہی ہیں۔ کیا یہ آج کے اس جدید سماج کا روشن مستقبل ہے۔ کیونکہ بقول جدید سماج کے معماروں کے اس قسم کا خیال ایک دقیانوسی خیال ہے۔ اسے یاد آیا کہ وہ اس دوڑ میں شریک نہیں ہے۔

پھر اس دوڑ کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہے۔ وہ تو کالج کی دوڑ میں شریک ہو رہا ہے۔

وہ ادھیڑ عمر کی عورت جو سڑک پر کسی کنواری کی طرح چل رہی تھی۔ کس دوڑ میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ بوڑھاپا پوری قوت کے ساتھ اس پر یلغار کر رہا تھا۔ وہ اس بوڑھاپے سے خود کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ وہ قانون خدا کے راستے میں دیوار بننا چاہتی ہے۔ وہ بوڑھاپے کی جھریوں کو غازے میں چھپانا چاہتی ہے۔ وہ سفید بالوں پر خضاب لگا کر سیاہ رنگ میں چھپانا چاہتی ہے۔ لیکن کب تک۔ اس کی میک اپ کی دوڑ اس کو کہاں تک لے جائے گی۔ اس کے اشارے کب تک نوجوان لڑکوں کو اپنی طرف مائل کرتے رہیں گے۔ کب تک نوجوان ایسی عورتوں کو دیکھ کر فحش گالیاں بکتے رہیں گے۔ کب ان کو یہ احساس ہوگا کہ یہ جانور نہیں...... ایک عورت ہے۔ جو ماں ہے، جو بہن ہے، جو بیٹی ہے۔ فحش گالیوں کی یہ دوڑ ان نوجوانوں کو کہاں لے جائے گی.....لیکن وہ اس دوڑ کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہے۔ اس کو ایسی دوڑ میں شریک نہیں ہونا تھا۔ اس کو ایک سیدھی سادی دوڑ میں شریک ہونا تھا۔ جس میں فاصلہ طے کرنا ہے۔ لیکن اب وہ کیسے اس فاصلے کو طے کرے گا۔ اس کو یاد ہے کہ پچھلے سال بھی اس نے تین میل کی دوڑ میں پہلے نمبر پر آ کر ایک چاندی کا کپ حاصل کیا تھا۔ لیکن تب وہ اس جدید سماج کی دوڑوں کے بارے میں نہیں سوچتا تھا۔ اس کو یاد آیا کہ روس اور امریکہ کے درمیان ایٹم بم، ہیڈروجن بم اور آکسیجن بم کی دوڑ ہے۔ انسان کو یہ دوڑ کہاں لے جائے گی۔ دنیا نے ایک تباہ کن راستہ اختیار کیا جہاں ہر دم موت کا سایہ انسانی زندگیوں پر لٹکتا ہے۔ جہاں ویت نام کے بموں کا دھواں ہزاروں انسانوں کو موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ بھی تو ایک دوڑ ہے۔ ایک ایسی دوڑ میں Communism اور Captilism ایک دوسرے سے سبقت لینا

چاہتے ہیں۔ جس نے دنیا کے امن وامان درہم برہم کردیے۔ جس نے سچائی کو جھوٹ کے لبادے میں ڈھانپ لیا۔ یہ دوڑ انسانوں کو کہاں لے جائے گی۔

لیکن جانے دو اس دوڑ کو..... اس دوڑ کے تذکرے کو..... کل اس کو ایک بار پھر تین میل کی دوڑ میں شامل [illegible] اس کو ایک مقرر کردہ فاصلے کو طے کرنا ہے۔ اس فاصلے کو طے کر کے ہی وہ چاندی کا کپ [illegible] کرسکتا ہے اور اس طرح وہ سب میں ایک امتیازی حیثیت بھی حاصل کرے گا۔ لیکن [illegible] یہ چاندی کا کپ۔ جبکہ دنیا میں ایسے ہزاروں کپ اقتدار کے بھوکوں کے پاؤں تلے [illegible] جاتے ہیں۔

کب تک جنوبی افریقہ میں سیاہ فام لوگوں کو رنگ ونسل کے امتیاز پر سفید ان کو کچلتے رہیں گے۔ انسانیت کے علمبردار کب انکی حفاظت کے قابل بن سکیں گے۔ کب تک یہ نسلی امتیاز کی دوڑ دنیا میں رہے گی۔ کب تک رنگ کی بنا پر امریکہ جیسے تہذیب یافتہ ملک میں Negro کو دوسرے درجے کی شہریت کا درجہ ملے گا۔ کیا یہ دوڑ Darking کو قتل کرنے تک انسانوں کو مجبور کرے گی۔ کیا سچائی کے ان حقیقی علمبرداروں کا یوں ہی خون بہایا جائے گا۔ وہ چیخ پڑا۔

''نہیں۔ اشرف المخلوقات ایسی دوڑ میں شریک نہیں ہوگی۔ اس کو ایسی دوڑوں میں شریک ہونے سے روک لینا چاہیے۔''

کالج کی اس دوڑ نے اس کے سامنے دنیا کی دوڑوں کا خاکہ کھینچ دیا۔ اس خاکے نے اس کو الجھن میں ڈال دیا۔ جب صبح وہ کالج کی دوڑ میں شریک ہوا تو اس کے سامنے دنیا کی دوڑوں کا خاکہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اشرف المخلوقات اپنے آپ کو کہاں تک لے جائے گی۔ لیکن جب وہ دوڑ پوری کر کے کالج واپس پہنچا تو لڑکوں نے تالیاں نہیں بجائیں۔ انہوں نے جیت کی خوشی میں اس کے نام کے نعرے نہیں لگائے۔ سب خاموش کیوں ہیں۔ کسی نے اس سے کہا۔

''اکبر تم ہار جاؤ گے کسی کو یقین نہیں تھا۔ پھر یہ......''

''میں ہار گیا۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''میں نہیں ہارا۔''

ہاں جو بھی زمانے کی ان الجھنوں کے لیے سوچتا ہے...... ہار جاتا ہے۔

سگریٹ

میں نے سگریٹ سلگایا۔ ہاں سگریٹ سلگایا۔ ایک لمبا کش لیا...... پھر...... پھر......
دھواں پھیل گیا۔ میں بڑبڑایا۔

"کتنا اچھا دھواں۔" پھر چیخ پڑا۔ "نہیں برا ہے۔"

پھر مجھے محسوس ہوا کہ دھواں سگریٹ کے ایک کش کے ساتھ باہر آگیا اور پھیلتا گیا......اس قدر پھیل گیا کہ میں اس دھوئیں میں قید ہو گیا تھا۔ اور اس کو چیر کر خود کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں تو سگریٹ کا کش پر کش لیتا رہا۔ جس دھواں میں قید تھا اسی میں اضافہ کرتا رہا تھا۔ میں بے وقوف ہوں۔ میں خود پر ہنس پڑا۔ لیکن یہ ہنسی تلخ تھی۔ میں پھر چیخ پڑا۔

"سگریٹ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں۔ کیا کبھی تو میرے کام آیا۔ تو ہر وقت میری زندگی میں طوفان کا باعث بنا۔"

میں نے نفرت سے سگریٹ کو پاؤں کے تلے مروڑ دیا اور ہاتھوں سے اپنے اردگرد کا دھواں ہٹانے لگا۔

"لیکن کیا میں اس قید سے آزاد ہو کر دنیا کی قید سے بھی آزاد ہو جاؤں گا۔"

یہ میرے لیے ایسا ہی سوال تھا جیسے موت کب آنے والی ہے۔ اس سوال کو حل کرنے سے پہلے مروڑے ہوئے سگریٹ نے قہقہہ لگاتے ہوئے میری نادانی پر ہنسنا شروع کیا۔ اس قتل کیے ہوئے سگریٹ کی بے وقت کی ہنسی مجھے بری طرح کھٹک رہی تھی۔ میں بڑبڑایا۔

"کمبخت آج سے میں نے تیرے ساتھ رشتہ توڑ لیا۔"

مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔

"تیرا اور میرا رشتہ اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹے گا۔ پندرہ سال پرانا رشتہ۔ یاد ہے تم کو، جب تمہارا اور میرا رشتہ قائم ہوا۔ ان دنوں تم دس سال کے تھے۔ پانچویں میں پڑھ رہے تھے۔ چوری چھپے تم میری تلاش کرتے تھے۔ کبھی ابا کی ایش ٹرے سے میرے چھوٹے ٹکڑے منہ میں رکھ کے چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے کش لیتے تھے۔ میں بھی کتنا خوش ہوتا تھا۔ کتنی ہی دفعہ تمہیں میرے لیے مار پڑی، کتنی ہی دفعہ تمہیں میرے لیے اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن نہ تم نے مجھے چھوڑا نہ میں نے تمہیں۔ ہم دونوں کا رشتہ مرتے دم تک قائم رہے گا۔"

مجھے سگریٹ کی بے وقت کی بانسری پسند نہ آئی۔ میں طیش میں آگیا۔

"کیا کہتا ہے، تیرا اور میرا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ تیری وجہ سے میرے سب رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ یاد ہے تم کو میرا ایک ہی دوست تھا۔ سردار کرپال سنگھ۔ میں اس کو جان سے بھی عزیز رکھتا تھا۔ ایک دن میں نے مذاق میں اس کو تجھے پینے کی دعوت دی تو وہ آپے میں نہ رہا۔ اس نے کہا۔

"تم نے ایک سکھ کی بے عزتی کی۔"

اور دیکھتے ہی دیکھتے برسوں کی دوستی ٹوٹ گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ جانتے ہو کیوں؟ تمہاری وجہ سے......، اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں کبھی ایسا بے ہودہ مذاق اپنے دوست کے ساتھ نہیں کرتا۔ تیرے ساتھ رشتہ جوڑنے کی وجہ سے میری دوستی قربان ہوگئی۔ پھر وہ قتل کیا ہوا سگریٹ مسکرا پڑا۔

"پھر بھی تمہارا اور میرا رشتہ نہیں ٹوٹا۔ لگتا ہے تمہارا اور میرا رشتہ تمہاری دوستی سے محکم اور قوی ہے۔" میں نے غصے میں اس مروڑے ہوئے سگریٹ کو لات ماری۔

"کمبخت ناز کرتا ہے اپنے اس رشتے پر۔ جانتا نہیں کہ اس رشتے نے میرے جذبات کی کیا درگت بنائی۔ دل کے سکون کے واسطے اگر میں سکینہ کے ساتھ چند لمحے گذارتا تو تو جل کر ہم دونوں کو کیوں تکتا تھا۔"

"سگریٹ چھوڑ دو۔"

"سگریٹ چھوڑ دوں۔"

"ہاں چھوڑ دو۔ لیکن اس کا دھواں مجھے پسند ہے۔"

"تمہیں دھواں پسند ہے"

"ہاں مجھے دھواں پسند ہے۔"

"تم سگریٹ نہیں چھوڑ سکتے۔" سکینہ نے کھڑے ہو کر [illegible] جواب طلب کیا۔

"تم دھواں چھوڑ دو۔"

اس نے مجبور آواز میں جواب دیا۔

"میں دھواں نہیں چھوڑ سکتی۔ تم اچھی طرح سے جانتے [illegible] مجھ [illegible] اتنی طاقت نہیں کہ والدین کے خلاف بغاوت کر سکوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم دھوئیں میں اپنا راستہ تلاش کرنے کو تیار نہیں۔ بھلا میں کیسے سگریٹ چھوڑ دوں۔ جو کچھ نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے تسکین دے دیتا ہے۔"

سکینہ نے غصے میں زمین پر لات مارتے ہوئے کہا۔

"تم ضدی ہو۔"

"وہ چلی گئی۔ بہت دور چلی گئی۔ بھلا ایک مفلس افسانہ نگار کے پاس اس کے بڑے خاندان کے حسب ونسب کے لیے کہاں جگہ تھی۔ وہ قلم کے کرنل کی نہیں فوج کے کرنل کی بیوی بن گئی۔ اف میں کیا سوچنے لگا ہوں اب تو یہ پرانی بات ہوگئی۔ شاید چند دنوں اس کا میرا ساتھ رہتا۔ لیکن اے سگریٹ تجھے کب یہ گوارا تھا۔ تعلقات توڑ کے میں تجھ سے انتقام لوں گا۔"

نہ جانے میں کیا کیا سوچتا رہا۔ پرانی یادوں نے وہ سب یاد دلایا جو میں بھول جانا چاہتا تھا۔ جن کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یادوں کا آدمی کیا کرے۔ یہ ذہن میں چلی آتی ہے۔ میرا دماغ ان کو یاد کر کے تھک گیا تھا۔ تھکے ہوئے دماغ کو تروتازگی چاہیے تھی۔ میرا ہاتھ بے خبری کے عالم میں سگریٹ کی ڈبیہ پر پڑ گیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جلتا ہوا سگریٹ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"ٹوٹ گیا رشتہ۔"

میں نے چاہا کہ اس کو پھینک دوں لیکن .... صرف اتنا کہہ سکا۔

"یہ رشتہ آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتا۔"

اور پھر سگریٹ کا لمبا کش۔

وعدہ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصور کا

یہ شعر گنگنا کے میرے دوست نے میری طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے کہا۔

"حقیقت ہے اس میں کچھ۔"

"آ۔"

"عجیب آدمی ہو تم۔"

"عجیب آدمی ہوں میں۔"

"نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے کہ الٹے سیدھے جواب بکتا ہوں۔ میں سوچنے لگا کہ واقعی میں ایک عجیب آدمی ہوں۔ ایک ایسا آدمی جو ہر بار اپنے رنگ میں کھویا رہتا ہے۔" میرا دوست اکثر پوچھتا۔

"ہوا کیا ہے تجھے؟"

میں سوچ میں پڑ جاتا۔ میں نے اس کے چہرے کو دیکھا جو خوشی سے سرشار تھا.......

"اقبال تمہیں تو سب کچھ ملا.....اور......"

اقبال اور میں جس راستے پر جا رہے تھے۔ اس کے دونوں طرف قبرستان تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ قبر سے باہر روح آ کر فریاد کر رہی ہو۔

"شاید مرزا غالب نے یہ شعر قبرستان کو دیکھ کر کہا ہوگا۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصور کا

میرے دوست نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شاید......لیکن ساحر نے ضرور یہ شعر شاہجہاں کی قبر کو دیکھ کر ہی کہا ہوگا۔

جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے

روکے زمانہ چاہے روکے خدائی تم کو آنا پڑے

یہ شعر سن کے مجھ پر وحشت طاری ہوگئی۔ ایسی وحشت کہ میں بے تحاشہ دوڑنے لگا۔

میرا دوست پکارتا رہا۔

''امجد.....امجد.....امجد۔ رک جاؤ۔ کہاں جا رہے ہو؟''

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اپنے دوست کی چیخ و پکار سنوں۔ میں دوڑتا رہا۔

دماغ نے مجھ سے کہا۔

''کہاں جانا ہے تمہیں؟''

''کہاں جانا ہے مجھے؟''

یاد آیا کہ میں ممتاز کو ڈھونڈ رہا ہوں۔

میں چیخ پڑا۔ ''ممتاز''

میری نظر اس قبر پر پڑی۔ جہاں ممتاز سوئی تھی۔ جہاں ایک سیاہ پتھر کے نیچے ممتاز کے ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔

''ممتاز......میری بیوی......کہاں ہو۔''

میں نے جب شاہ جہاں بن کر ممتاز کے ساتھ شادی رچائی تو سمجھا کہ ہم دونوں محبت کا تاج محل تعمیر کریں گے۔ شاندار تاج محل، ایک جھوٹا خواب تھا۔ ایسا خواب جس سے حقیقت دور بھاگ رہی تھی۔ میرے خواب چکنا چور ہوئے.....اف.....اف تم وہ نہ ثابت ہوئی جو میں نے سمجھا تھا۔ ہم دونوں اس کشتی میں سوار ہوئے۔ جس نے منزل چھوڑ دی تھی اور منجدھار میں آگئی۔ میں خوشیوں کا محل تعمیر نہ کرسکا۔ تو.....کیا ہوا۔ پھر بھی ایک سہارا تھا جو کھو کھلا سہی......

لیکن تھا..... شاید تمہیں یہ معلوم نہ تھا کہ میں ایک اور ممتاز کو تلاش کرنے نکلا تھا۔ رضیہ شاید ممتاز ہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی اور معصوم آنکھیں یقین دلا رہی تھیں کہ میں ہی تمہاری ممتاز ہوں۔ اس نے کہا۔

"شاہجہاں چھوڑ دو سب کو اور چلے آؤ اپنی ممتاز کے پاس۔ ہم دنیا سے دور اپنا تاج محل بنائیں گے جہاں میں ہوں گی تم ہو گے۔"

لیکن میں کیسے تمہیں چھوڑ دیتا۔ جس کو میں نے ممتاز سمجھا تھا جس کو میں نے شاہجہاں [illegible]۔ لیکن قدرت نے، میں نے لاکھ چاہا کہ تم قدرت کے جلال میں نہ آؤ۔ لیکن اب یہ جلال آتا ہے۔

"تمہاری ممتاز تو رضیہ ہے۔"

موت نے اپنا منہ کھولا۔ تم ہنس پڑی۔

"امجد میں جا رہی ہوں۔ لیکن وعدہ کرو کہ تم کبھی شادی نہیں کرو گے۔ وعدہ کرو۔"

کیا میں اپنی ممتاز کو حاصل نہ کروں۔ یہ میرے لیے سوال تھا۔ ایک ایسا سوال جس میں میری خوشی کا راز پنہاں تھا۔ یک آدمی نے میرا کندھا دبایا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تمہارا بوڑھا باپ تھا۔ جس نے مجھ سے کہا۔

"مرنے والی کی آخری خواہش پوری کو۔"

میں پاگل تھا...... جو ہاتھ بڑھا کر یہ کہہ گیا۔

"ممتاز میں وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر دوسری شادی نہیں کروں گا۔"

پھر...... اس کے ساتھ موت کا کھلا ہوا منہ بند ہو گیا۔ تیری روح تیرے جسم کو چھوڑ کر چلی گئی اور میں دیکھتا رہا۔

تم نے میرے کندھوں پر، میرے ضمیر پر اور مجھ پر ایسا بوجھ رکھا جس کو میرے کمزور ہاتھ ہٹا نہیں پائے۔ تم نے میرے پاؤں میں وہ زنجیر ڈال دی کہ میں ممتاز حاصل نہ کر سکا۔ اس دن مجھے سارا جہاں جلتا ہوا محسوس ہوا۔ جب مجھے کسی نے کہا۔

"شاہجہاں کی ممتاز کو کسی اور نے عقد میں لے لیا۔"

میں کچھ نہ کرسکا۔ صرف دیکھتا رہا۔

میں نے اس کی قبر کے کالے پتھر سے کہا۔

''تو ظالم ہے..... جلاد ہے۔ تو نے میری خوشیاں چھین لیں۔ کیا حق تھا تمہیں میری خوشیاں چھین لینے کا۔''

میں جنون میں تھا..... پھاوڑا اٹھایا اور ممتاز کی قبر کو کھودنے لگا۔

''میں انتقام لوں گا۔ تجھے سکھ کے ساتھ قبر میں نہیں رہنے دوں گا۔''

مجھ پر وحشت کا عالم تھا۔ میرا دوست اقبال ہانپتے ہوئے میرے پاس پہنچ گیا۔ اور میرے اس جنون کو دیکھ کر چیخ پڑا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں۔''

''کیا ہوا ہے مجھے؟''

میری اس جنونی حالت کو دیکھ کر ہم دونوں کے اردگرد چند لوگ جمع ہو گئے۔ انہوں نے مل کر میری وحشت پر قابو پایا۔ ''پاگل ہے۔''

اگر وہ مجھے پاگل سمجھتے ہیں تو ان کو سمجھنے دو۔ اقبال سمجھتا ہے کہ بیوی کی موت نے میری یہ حالت کر دی۔ میں چیخنا چاہتا ہوں۔ سب سے کہنا چاہتا ہوں.....

''ایک وعدے نے میری یہ حالت کر دی ہے۔''

تقدیر

تقدیر کا لفظ جب کوئی میرے سامنے بولتا ہے تو میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔
اس لفظ کے ساتھ مجھے چچا غالب کا یہ شعر بھی یاد آتا ہے۔

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندہ معنی نہ ہوا

بقول غالب وفا کا لفظ کبھی شرمندہ معنی نہ ہوا۔لیکن تقدیر کے لفظ کے ساتھ کچھ الٹ ہی معاملہ وابستہ ہے۔میرے خیال میں ازل سے اس لفظ کو شرمندگی، حقارت اور ذلالت کا بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے۔اب اس بد بخت لفظ کا جو بھی ذکر کرتا ہے تو یوں کرتا ہے۔

''بے چارے کے والد چل بسے..... تقدیر میں لکھا تھا۔''

''وہ دیوالیہ ہو گیا۔تقدیر بے چارے کی تقدیر۔''

کوئی کنواری لڑکی شادی سے پہلے کسی ایرے غیرے کے ساتھ رشتہ جوڑ لیتی ہے اور کنواری ماں بن جاتی ہے۔تو اس کی ماں لمبی سانس لیتے ہوئے کہتی ہے۔

''یہ دن....... تقدیر میں لکھا تھا۔''

کرے ایسی کرتوت خود اور کوسے تقدیر کو۔اس دنیا کا یہ الٹا قانون ہے۔اب دیکھئے کوئی دو تین سال میں بہت بڑا تاجر بن جاتا ہے۔تو کوئی کہتا ہے۔

''تقدیر کا یہ تماشہ دیکھو۔''

اور کسی کے لب پر ہوتا ہے۔

''اجی حضرت یہ غیر معمولی قابلیت رکھتا ہے۔''لیکن صاحب کوئی بھی تقدیر کے یہ

تماشے دہرانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کمبخت لفظ تقدیر کے حصے ذلالت اور حقارت کے سوا اور

کچھ نہیں آیا۔ خود میں بھی اس لفظ کا اس قدر بڑا دشمن تھا کہ میری زبان اس کو گالیاں دیتے ہوئے تھکتی نہیں تھی۔ جب اسکول کے دنوں میں میری پنسل یا کتاب کھو جاتی تھی۔ اس لفظ کی شامت آجاتی تھی۔

حضور اس نادان بندے کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے یوں کہیے، اس حلقے میں سب قسم کے لوگ موجود ہیں۔ کوئی شاعر ہے تو کوئی ادیب ہے تو کوئی مسخرہ ہے۔ میرے ان دوستوں میں مسخرہ دوست بیکل کبھی کبھی پتے کی بات کہہ جاتا ہے۔

ایک دن ہم نافہم دوستوں کا یہ چھوٹا سا خاندان ادبی اور بے ادبی دونوں قسم کی گفتگو کر رہا تھا۔ کوئی صاحب کہہ اٹھے۔

واللہ بھائی کیا چال ہے اس کی؟ کیا ہونٹ ہیں اس کے؟ کیا قد ہے اس کا؟......

شاعر صاحب کہہ اٹھے۔

''دوستو میں چچا غالب کے اس شعر کا اب تک مطلب نہ جان سکا۔

میری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی
ہیولا برق خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

فلسفی صاحب اپنا نکتہ لے کر سامنے آ گئے۔

''میں ......میں ہوں......آخر یہ ہوا کیا؟''

محفل میں اس دن جان نہ تھی۔ کیونکہ بیکل صاحب غیر حاضر تھے۔ خدا نے دل کی آواز سن لی اور وہ دوڑے دوڑے ہمارے پاس آئے۔ ان کے ماتھے سے صاف نظر آ رہا تھا کہ غصہ حملہ آور ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

''کہیے صاحب آپ اب تک کہاں رہے۔''

میرا اتنا کہنا کہ شکایتوں کا لمبا دفتر کھل گیا۔

''حماقت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ جہالت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ہر وقت بس یوں ہی بکے جاتے ہیں۔ الٹا سیدھا جو کچھ زبان سے نکلا۔ بس نکالا......زبان نہ ہوئی کوئی نقارہ

ہوا۔'' میں نے ان کی لمبی تقریر پر بریک لگاتے ہوئے کہا۔

''بیکل صاحب جس چیز کی وجہ سے آپ کو اپنی روح میں سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ بیان کیجیے۔'' بھلا ہو بیکل کی زبان کا جس نے پھر اختصار سے کام لیا۔

''[illegible] حضرت وہ میرے چاچا ہے نا..... اپنے آپ کو عالم دہر سمجھتے ہیں۔ ان کی اہلیہ بیمار ہوگی۔ اس کی بیماری کا باعث اس کے پیٹ میں پل رہا بچہ ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ بچہ چنچل ہے۔ [illegible] ہتھیاروں کے بغیر باہر نہیں آئے گا۔ خیر یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ میں چاچا [illegible] چاچا کے دماغ کو دیکھیے، کہنے لگے۔ ''بیٹا تقدیر کی بات ہے'' میرے دوستو [illegible] چاچا [illegible] کام کیا اور دوش تقدیر کو دیتے ہے۔ لفظ تقدیر کی یہ بے حرمتی مجھ سے برداشت نہ ہوئی۔ آخر یہ انسان اپنے ہر ایرے غیرے کام کو تقدیر کا سہارا لے کے تقدیر کے لفظ کو کیوں بدنام کرتا ہے۔'' دوستو اس غلط قسم کے رجحان کے خلاف ہمیں لڑنا ہے۔ انسانی ذہن کو صاف ستھرا کر کے اس کے پتھریلے مغزوں میں اس لفظ کا صحیح مطلب چسپاں کرنا ہے۔'' مجھے اپنا بچپن یاد آیا۔ ہر چھوٹی بات کو ایٹم بم میں تبدیل کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ Strike پر Strike کرنا تو ہماری عادت بن گئی تھی۔ میرے دماغ سے ایک پرانا نقشہ نکل گیا۔ میں نے کہا ''لیکن بیکل صاحب تقریروں سے کام نہیں چلے گا۔ انسانی ذہن کے اس رجحان کو ختم کرنے کے لیے اور اس لفظ کو صحیح مقام دلانے کے لیے ہمیں ایک انجمن قائم کرنی ہوگی۔''

میں نے اپنی تقریر ابھی پوری نہ کی کہ شاعر صاحب کہہ اٹھے۔

''ضرور..... یہ انجمن قائم ہونی چاہیے۔ انقلاب جب تک نہ ہو بات ہی نہیں بنتی۔''

بیکل نے بھی میرے اس خیال کی تائید کی لیکن ہمارے فلسفی دوست اور مصور نے میری اس تجویز پر ایسی قے کی کہ ان کی اور ہماری دوستی کی رسی ٹوٹ گئی۔

''ہمارے خیالات سے کمیونزم کی بو آرہی ہے۔ ہم خون خرابہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

اس میں سچائی ہے کہ اگر وہ دونوں خاموشی سے نہ چلے جاتے تو خون خرابہ ہو ہی

جاتا۔ میں نے اپنے ناداں غصے پر قابو پا کے عزیز اور باعقل دوست بیکل سے کہا۔

''اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کتابچے تقسیم کرنا ضروری ہیں اور اس کے لیے ایک فنڈ کمیٹی بھی وجود میں آنی چاہیے۔'' میرے دوستوں نے اس تجویز کو سراہا۔ مجھ ''نااہل'' کو ''تقدیر انجمن'' کا صدر چن لیا گیا۔

پھر میرے دوست فنڈ جمع کرنے نکلے۔ کوئی گیارہ سو گیارہ ر[illegible]ئے تھے۔ انجمن کی اقتصادی حالت خراب تھی لیکن پبلسٹی زوروں پر جاری تھی۔ چھ[illegible] روپئے اپنی جیب سے ڈال کر ایک کتابچے میں یہ کہا کہ انسان کا اخلاق سدھارنے کے لیے تقدیر کمیٹی وجود میں آئی ہے۔

عوام کو کوئی مسالہ چاہیے۔ شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ ہوا یہ کہ مخالف پارٹی اور حکمران پارٹی دونوں اس نام نہاد تقدیر کمیٹی میں دلچسپی لینے لگیں۔

حکومت ہم کو اپنی غرض کے لیے استعمال کرنا چاہتی اور مخالف پارٹی اپنی غرض کے لیے۔ لیکن ہم ٹھہرے اس میدان کے پرانے کھلاڑی۔ ہم نے دونوں کو اپنے پیٹ کے لیے استعمال کیا۔ اب اکثر ہم دوست ہوٹلوں میں کباب اور حلوے اڑاتے نظر آتے۔ میرا بیکل دوست جلوہ دیکھنے کے لیے بیتاب تھا۔ جلوے بھی دیکھے۔ کبھی ایک بازو میں گندمی رنگ کی لڑکی رہتی کبھی دوسرے بازو میں گوری۔ والدین کو ہماری نیت پر اکثر شک ہوتا تو کہتے۔

''امی یا ممی ابا یا ڈیڈی ہم Youth کا ذہن Revolutions کر کے ان کو نئی اخلاقی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کا درس دیتے ہیں۔''

ہمارے بھولے بھالے والدین ہماری ذہنیت اور اپنی نادانی پر ناز کرتے۔

لیکن یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ سی.آئی.ڈی محکمہ ہماری حقیقت جاننے کے لیے کمر کس کے پیچھے پڑ گیا۔

حکومت نے جب سمجھا کہ یہ پارٹی دونوں پارٹیوں کا مال اڑا کے اپنی ہی دھن میں کھوئی رہتی ہے تو ہماری اس اخلاقی اور تقدیر پارٹی کو توڑنے کے منصوبے سوچنے لگی۔

لیکن تقدیر پارٹی اس قدر مشہور ہوئی تھی کہ ان کو ڈر تھا کہ کہیں لوگوں کا غنڈا طبقہ

بغاوت نہ کر بیٹھے۔ اس لیے عقل سے کام لے رہے تھے۔

ہمارے دوست جو شاعر تھے ان کی شاعری میں زیادہ ذکر گانے بجانے کا ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو چند اشعار ۔

گاتا ہوں اور گاتا ہوں

تر[illegible]ہا نئی ترنگیں

دل[illegible] ہیں

[illegible]ی

جا[illegible] ہے

چونکہ ہمارا دوست تھا۔ اس لیے واہ! واہ!! ہا! ہا!! کرنا تو ہمارا فرض تھا۔ کبھی کبھی میں بے اختیار بول اٹھتا۔

''اس میں فلسفہ کی نانی پنہاں ہے۔'' اچھے خاصے ماہنامے والوں نے اتنی اچھی شاعری کو خدا حافظ کہہ دیا۔ لیکن حکومت نے جہاں ہماری تقدیر کمیٹی کو ختم کرنے کے لیے جلاد کی تلوار نکالی تھی۔ وہاں پہلا وار ادب پر پڑا۔ ادب کے نام پر غلاظت کو ادب کے سرچشمہ کا نام دے کے چھاپ دیا گیا۔

یہ کتاب کیا چھپی کہ ہمارے شاعر دوست نے کہا کہ تقدیر انجمن دراصل ایک ڈھونگ ہے، فریب ہے۔ یہ تو بیرونی ملکوں کے ساتھ ملی ہوئی جماعت ہے۔ حالانکہ بیرون اور اندرون ہم کبھی جان ہی نہ پائے۔

بیکل صاحب نے نئی ہوا کو آتے دیکھا تو وہ بھی حکومت کے جوتوں کی پالش کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ سرخ وسیاہ پالش رنگ لائی۔ وہ مقامی اسکول میں استاد کیا بنے کہ انجمن کو دشمن عناصر قرار دے کر کہا۔

''مجھے اب تک اس بات سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ دراصل تقدیر کمیٹی بیرونی ملکوں کا ایک خفیہ اڈہ ہے۔ جب شاعر عظیم سرچشمۂ ادب نے اس بات کا انکشاف کیا تو میں حقیقت جاننے کے لیے بے قرار ہوا۔ بالآخر حقیقت معلوم کر کے اس انجمن کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا۔''

میں نے دل میں کہا کہ چلو اچھا ہی ہوا کہ ان نااہل دوستوں کی حقیقت کھل گئی۔ لیکن نااہل دوستوں کے ان بیانات نے مجھے جیل کی اندھیری کوٹھری میں ڈال دیا۔ مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ یہ قوم دشمن عناصر کے ساتھ کام کرتا ہے۔ چھ ماہ کی قید ہوئی۔ فو[illegible]ان آ گیا۔

''تقدیر اپنی بری ہے۔''

جی ہاں حقیقت بھی تو ہے۔ تقدیر کے لیے اتنا کچھ کیا ور تقدیر[illegible]ساتھ نہ دیا۔

وقت اور رنگ

ٹیگور ہال کا وہ مشاعرہ ادب نواز لوگ کبھی نہیں بھول سکتے۔ میری مختصر نظم کی بھی بہت تعریف ہوئی۔ چند لوگوں کو اس نظم نے اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے مجھے دعوت پر بلایا۔ ان حضرات میں سیٹھ کھجور چند تھے۔ تیس سال کے یہ سیٹھ...... اب تک کنوارے تھے اور اول درجے کے امیروں میں گنے جاتے تھے۔

جب میں ان کی شاندار حویلی میں داخل ہوا تو منہ سے نکل پڑا۔

"حضور یہ حویلی نہیں بادشاہ کا محل ہے۔"

کھجور چند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس آپ کی عنایت ہے۔"

"اجی میری کیا عنایت ہے۔ آپ پر تو خدا کی عنایت ہے۔ جس نے آپ کو بلا کسی محنت کے اتنی بڑی جائیداد کا مالک اس کم عمری میں بنایا۔"

سیٹھ کھجور چند زندہ دل آدمی تھے۔ میرے ان جملوں پر زور زور سے ہنسنے لگے۔

"آپ کو لوگ انقلابی شاعر کہتے ہیں۔"

"سیٹھ صاحب میں نے حقیقت بیان کی۔ اگر حقیقت کا نام انقلاب ہے تو مجھے انقلابی شاعر ہونے میں کو اعتراض نہیں۔"

گفتگو کرتے ہوئے ہم دونوں ایرانی قالینوں سے سجائے گئے ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے کے ساتھ ایک اور کمرے سے کچھ جانوروں کی آوازیں آنے لگیں۔

"اس شاندار حویلی میں جانور کہاں ہوں گے۔ شاید میں وہم میں پڑ گیا ہوں۔"

لیکن پھر وہی آوازیں آئیں۔ ان آوازوں کے ساتھ میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں نے

سیٹھ صاحب سے کہا۔

''اگر اجازت ہو تو میں یہ کمرہ دیکھ لوں۔''

''پہلے آپ شربت پی لیجیے۔ پھر دیکھ لیجیے۔''

شربت کا گلاس میں نے ایک ہی سانس میں خالی کیا۔ سیٹھ [illegible] ہوئے کہا۔

''چلئے میں دکھاؤں گا آپ کو وہ کمرہ۔''

میں جب کمرے میں داخل ہوا تو سمجھا کہ کسی چڑیا گھر میں [illegible] سے آ گیا ہوں۔ وہاں ایک سفید کبوتر لوہے کے پنجرے میں تھا۔ ایک کتے اور ایک مرغی کے علاوہ چندن کی الماری میں چھوٹا سا سرخ رومال تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے دم بخود رہ گیا۔ سیٹھ کھجور چند نے مجھ سے کہا۔

''کیوں شاعر صاحب آپ کہاں پہنچ گئے؟''

''میں۔ میں تو یہاں ہی ہوں۔ لیکن آپ نے یہ چڑیا گھر کیسے بنایا؟''

''کیا کہا آپ نے؟'' سیٹھ کرسی سے اٹھ گئے۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ میری بات سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔

''آپ نے میری محبت کی توہین کی ہے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو دکھ ہوا۔'' میں نے معذرت کی۔

''لیکن آخر ان سب چیزوں کو اکٹھے کرنے کا کیا مطلب؟''

''کیا بتاؤں...... یہ محبت کی لمبی کہانی ہے۔''

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''محبت اور یہ چیزیں...... حضور مجھ جیسا زلفوں میں کھونے والا شاعر اس کمرے کو دیکھ کر نہ جانے کہاں کھو گیا۔''

''شاعر'' کھجور چند نے ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا۔ ''تم اس کہانی کو سننا چاہتے ہو۔ جس کو میں نے کسی سے اب تک نہ کہی۔ اف شاعر پرانی باتیں یاد دلا کر میری زندگی

کے زخموں کو نہ کریدو۔"

پھر وہ خاموش ہوا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ کشمکش میں پڑ گیا۔ پھر اس کی کھوئی ہوئی آواز میرے کانوں میں آگئی۔

"محبت... محبت...... آخر یہ محبت کیا ہے۔ ایک ہی بار میں نے تو اس کو دیکھا۔ پھر مجھ پر یہ جذبۂ محبت کیوں حملہ آور ہوا میں کیسے اس کے گندمی رنگ کے حسین چہرے کو بھول سکتا ہوں۔ لیکن اس کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ دیکھ لے کہ کوئی اس کی راہ میں کھڑا تھا۔ وہ کپڑے کی دوکان سے باہر آئی اپنی کار میں سوار ہو کے چلی گئی۔ وہ چلی گئی اور میں اکیلا کھڑا رہا۔ وہاں سڑک پر صرف ایک سرخ رومال تھا۔ حسن کا رومال۔ میں نے اسے اٹھایا اور آنکھوں سے لگایا۔ اپنی چندن کی الماری میں سجایا۔ یہ رومال مجھے یقین دلاتا ہے کہ حسن آئے گا، ضرور آئے گا۔"

سیٹھ خاموش ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ لوگ سچ مچ اپنے پاس دل رکھتے ہیں۔ میری طرح کوئی پتھر نہیں...... محبت کے اس چھوٹے سے واقعہ نے سیٹھ کی زندگی بدل دی۔

"واقعی آپ کی کہانی متاثر کن ہے۔ لیکن یہ کتا، یہ کبوتر، یہ مرغی......"

"ان کے ساتھ بھی یہی ابستگی ہے۔"

"کب سے؟"

"کب سے..... شاعر ایک نظم لکھو۔ میرے عشق کی یاد میں..... لکھو..... لکھو۔"

میں سوچتا رہا کہ اس بے ہنگم موٹے سیٹھ کو کوئی حسینہ کیسے پلکوں پر بٹھائے گی۔

میں کشمیر کے دلفریب مقامات کی سیر کرنے گیا۔ کبھی پہلگام کے سبزہ زار اور کبھی ڈل جھیل کی ہواؤں نے مجھے مدہوش کیا۔ لیکن میرا ذہن سیٹھ کی وہ پر تکلف دعوت نہ بھولا۔ اس لیے سرینگر سے روانہ ہونے سے پہلے ان کو الوداعی سلام کرنے ان کے گھر گیا۔

میں سیٹھ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کمرے میں جا پہنچا جہاں چڑیا گھر تھا۔ لیکن میں حیران ہوا۔ وہاں نہ کبوتر تھا، نہ کتا، نہ مرغی اور نہ سرخ رومال۔ وہاں چندن کی الماری میں صرف ایک ٹوٹی چپل تھی۔ جس کو بار بار میں عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے مجھے یقین نہ آتا ہو کہ وہاں ایک ٹوٹی چپل ہی تھی۔ سیٹھ کا نوکر دوڑتا ہوا میرے سامنے آیا۔

''بابو جی آپ تشریف رکھیے۔ میں شربت لاتا ہوں۔ سیٹھ جی آتے ہی ہوں گے۔''

میں نے اس سے کہا۔

''یہ چڑیا گھر کہاں گیا؟ اور یہ چپل۔''

''کیا آپ سیٹھ کو نہیں جانتے؟''

''کیا مطلب؟''

''سیٹھ نے اپنی بیوی کو اس لیے طلاق دے دی.....''

''کیا؟''

میں چیخ پڑا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔

نوکر نے آگے کہا۔

''کیونکہ وہ اس کی محبوبہ نہ بن سکی۔ اور اب اگر سیٹھ کی طرف کوئی لڑکی ہنس کے دیکھ لیتی ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کی محبوبہ بن گئی اور اس لڑکی کی کوئی نہ کوئی نشانی اٹھا لاتے ہیں۔ چند دنوں کے لیے یہ امید بندھ جاتی ہے کہ وہ لڑکی اپنی بانہیں پھیلائے ہوئے ان کے پاس آئے گی۔ لیکن بہت جلد وہ اس لڑکی کو بھول کر دوسری لڑکی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح تھوڑے ہی وقت میں یہ کمرہ کئی رنگ بدلتا ہے۔

سیٹھ کے اس انوکھے کردار نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں کبھی سیٹھ کے نوکر کو دیکھ رہا تھا، کبھی سیٹھ کی محبوبہ کی ٹوٹی ہوئی پرانی چپل کو۔

آغوش

صنف نازک کی مختلف آغوشوں میں آدمی پل کر جوان ہوتا ہے۔ بچپن میں ماں کی آغوش مل جاتی ہے۔ پھر یہی آغوش آدمی کو بالغی سے ہمکنار کرتی ہے۔ پھر اس کو محبوبہ کی آغوش ملتی ہے جس میں بہت کچھ پانا چاہتا ہے۔ اقبال قسمت کا مارا تھا۔ پیدا ہوا تو ماں موت کے منھ میں چلی گئی۔ پھر اس کو کبھی بچپن میں کسی اور عورت کی آغوش نہ ملی۔ وہ تو ہم جنس کے ہاتھوں بالغ ہوا۔

اس لیے عورت کی آغوش اس کے لیے معمہ تھی۔ جب وہ کالج میں اپنے کلاس میں بیٹھ کر طلباء پر نظر ڈالتا تو اس کی نظر صرف لڑکیوں پر جا کے ٹھہرتی۔ اس کے دماغ میں ایک سوال آتا۔

''میں بچہ بن جاؤں۔ پھر ان کی آغوش میں جاؤں۔''

پھر وہ اپنا سر ہاتھوں سے پکڑتا اور اپنے اس بچکانہ خیال پر شرمندہ ہوتا۔ لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو رضیہ سلطانہ اور شکیلہ کو دیکھ کر اس خواہش کا اظہار کرتا تھا۔ وہ دل کے اس خیال سے تنگ آ گیا تھا کہ دماغ نے صلاح دی۔

''شادی کر لو۔''

یہ بھی اقبال کے لیے مسئلہ تھا کہ وہ کس سے شادی کرے۔ خدا خدا کر کے اس کے انتخاب نے سلطانہ کو چنا۔ اقبال نے اس کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کے لیے حیلے، بہانے تراش لیے۔ ایک دن سلطانہ حساب کا سوال حل نہیں کر سکی۔ اس نے اقبال سے کہا۔

''آپ نے کل والا حساب کا سوال کیا۔''

اقبال تو ایسے موقع کی تلاش میں تھا۔

''جی ہاں.....میں نے وہ سوال حل کرلیا۔ آیئے دیکھیے۔''

سوال دکھاتے دکھاتے اس نے سلطانہ کو محبت کے رنگوں کا قوس قزح بھی دکھا دیا۔

دونوں اس رنگ میں کھو گئے اور ایک دن اقبال نے سلطانہ سے کہا۔

''میں دنیا کی تمام خوشیاں تمہاری گود میں ڈال دینا چاہتا ہوں''

''میں تمہارے تمام دکھ اپنی آغوش میں سمیٹ لوں گی۔''

اقبال سلطانہ کی آغوش میں بیٹھ جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اسے یہ خیال آیا۔

''کیا کر رہے اقبال۔ یہ تمہاری محبوبہ ہے۔ کوئی کھیل تماشہ نہیں۔''

یہ خیال آتے ہی اس کے تمام ارادے پسپا ہو گئے۔ اس کو محسوس ہوا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے زندگی کی عزیز ترین خواہش کا قتل کر دیا۔ وہ رات اس کے لیے اضطراب کی رات تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کی تمام خواہشات اور تمام اصول اس آغوش کے سامنے دم توڑ دیں گے۔

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔''

وہ چیخ پڑا۔ پھر سوچنے لگا کہ آخر کیسے۔ وہ اپنی اس انوکھی خواہش پر قابو پائے گا۔ دماغ نے کہا۔

''اس الجھن کا صرف ایک حل ہے۔''

''کیا؟''

''شادی کرلو۔''

اس نے اپنے دل کے ساتھ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی خواہش کا اظہار اپنے والد سے کرے گا۔

''ابا جان میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کا باپ اسی دن کے لیے زندہ تھا کہ کب اس کا بیٹا شادی کرے گا اور پھر وہ سکھ کے ساتھ مر جائے گا۔ اس نے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹے میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔ ہے تمہاری نظر میں کوئی لڑکی؟''

''جی ہاں ایک لڑکی ہے۔''

اقبال نے سلطانہ کا پتہ بتا دیا۔ سلطانہ کے والدین کو اس شادی سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شادی ہوگئی۔ اپنی حسین دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے اقبال نے کہا۔

''اف ...... یہ حسن۔ لگتا ہے دنیا کا سارا حسن تم میں سمٹ آیا ہے۔''

سلطانہ نے شرارت بھری آواز میں جواب دیا۔

''اور یہ سارا حسن تمہاری آغوش میں سمٹ جائے گا۔''

اقبال اپنے دل میں چیخ پڑا۔

''پھر وہی آغوش...... آغوش........''

لیکن اب تو اس کے پاس سب کچھ ہے۔ پھر بھی آغوش اس کے لیے الجھن کیوں بنی ہوئی تھی۔ اس کو آغوش ملی لیکن وہ نہ ملا جس کی تلاش میں وہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو ایسی آغوش ملے جو اس کے لیے بچپن کا جھولا بنے۔ لیکن سلطانہ اس کی بیوی تھی۔ کوئی بچپن کا جھولا نہ تھی۔ اس کا دماغ پھر الجھن میں پھنس کے رہ گیا۔

''آخر کہاں ملے گا مجھے وہ جھولا۔''

اس الجھن نے اس کا جینا دوبھر کر دیا۔ وہ ہر لمحے اس الجھن کا حل حاصل کرنے کی تلاش میں رہتا۔

ایک دن اس کے دوست امتیاز نے کہا۔

''یار اس کی شہرت تمام شہر میں پھیل گئی۔ تہلکہ مچا دیا ہے اس نے۔ لیکن تو وہاں نہیں جا سکتا۔ تم نے تو شرافت کا جامہ پہن لیا ہے۔ اب تو تم بیوی سے ڈرتے ہو۔''

اقبال طیش میں آ گیا۔

''کون ڈرتا ہے اپنی بیوی سے۔ چلو میں بھی دیکھوں اس چیز کو جس نے تہلکہ مچا دیا ہے۔''

جب اقبال اس بازار میں داخل ہوا تو واپس بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے ایک عورت

سے ٹکرا گیا۔ عورت نے کہا۔

''بچے تم کیوں بھاگ رہے ہو۔''

اقبال اس تیس سال کی عورت کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے کہا۔

''جی میرا دوست امتیاز مجھے یہاں لایا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ مجھے اس بازار میں لے آئے گا۔''

عورت نے اقبال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔''

نہ جانے کیوں اقبال کو محسوس ہوا کہ اس عورت کی آواز میں شفقت کا ایک خزانہ بھرا ہوا ہے۔ اس کے قدم خود بخود اس کے پیچھے اٹھتے گئے۔

پھر وہ قدم ہر دن اس دروازے پر نظر آئے۔ اس کو اس عورت کے پاس وہ آغوش ملی تھی۔ جس کی تلاش میں وہ تھا۔ یوں تو وہ چوری چھپے آتا تھا۔ لیکن بات کب تک چھپتی۔ بیوی نے جب یہ قصہ سنا تو اپنا سینہ پیٹنے لگی۔

''یا تم اس رنڈی کے پاس جانا چھوڑ دو یا مجھے ہی چھوڑ دو۔''

بے چارا فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔ وہ آغوش چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بیوی نے اس کو طلاق دے دی۔

والد نے کہا۔

''مجھے ناز تھا اپنے بیٹے پر۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ شرافت کا دیوتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ذلیل سے ذلیل حرکت کر سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں سنبھل جاؤ۔ ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔''

لیکن اقبال کب یہ سوچنے والا تھا کہ کیا اچھا ہوگا اور کیا برا۔ آغوش پا کر اس کی دماغی الجھن ختم ہو گئی تھی۔ والد صاحب اپنے بیٹے کے اس انداز سے تنگ آ گئے۔ تہذیب یافتہ لوگوں نے ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ اب تو ایسے لوگوں کا منھ بند کرنے کے لیے اور بیٹے کو سیدھا کرنے کے لیے صرف ایک ہی علاج تھا۔

دوسری صبح اقبال نے اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خبر بھی پڑھی کہ اس کے والد نے اس کو تمام جائداد سے محروم کر دیا۔ اسے صدمہ ہوا۔

"یہ سب ایک آغوش نے کیا۔ لیکن میں بھی آغوش کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"

وہ عورت کے گھر گیا۔ عورت نے کہا۔

"اس وقت کیسے آئے؟"

"آغوش میں چلا آیا ہوں۔ کیونکہ سب لوگوں نے مجھے دھوکا دیا۔ یہ آغوش مجھے دھوکا نہیں دے گی۔"

عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن پیارے اس آغوش میں وہی بیٹھ سکتا ہے جس کے پاس دولت ہو۔ اب تم کنگال ہو۔"

اقبال نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

"اف.....اف.....تو یہ بھی وہ آغوش نہیں ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں تو اس کو ایک ماں کی آغوش سمجھ بیٹھا تھا۔"

نامکمل تصویریں

جب یاد کی ہوا لاشعور میں سرسراتی چلی جاتی ہے تو کچھ بے ترتیب قدموں کا شور ہوتا ہے۔ الجھے ہوئے برقعوں میں کچھ الجھے ہوئے چہرے بند تھے۔ ان کی تیز اور کانپتی ہوئی آواز آئی۔

''پناہ چاہیے۔''

میں چونک پڑا۔

''آئیں۔''

میں نے خود کو کوسا۔ اس چھوٹے سے ڈاکخانے کو کوسا جہاں ہر وقت کاغذوں کا انبار رہتا تھا اور ہر وقت میں انہیں میں الجھا رہتا۔ باہر کیا ہوتا ہے؟ باہر کیا ہوا؟ باہر کیا ہوگا؟ سب سے بے خبر۔ اس لیے ان دو برقعہ پوش عورتوں سے پوچھا۔

''کیا لوگوں نے پھر کوئی ہنگامہ کیا۔ کیا پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ کیا لوگ بھاگ رہے ہیں۔ کیا شہر میں کرفیو ہے؟''

وہ دونوں ہنس پڑیں۔

میں ان کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ان کی ہنسی میرے لیے طنز بن گئی۔ میں ان کی ہنسی کو اپنے قہقہوں میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔

لیکن میں قہقہہ نہیں لگا سکا۔

کیونکہ وہ عورتیں تھیں .....اور میں مرد۔

''ایک سوال کا جواب دیجیے.....کیا......واقعی کوئی ہنگامہ ہوا۔''

"ہنگامہ ضرور ہوا جناب" ان دونوں عورتوں میں ایک نے کہا "لیکن لوگوں کے ساتھ نہیں۔ پولیس کے ساتھ بھی نہیں۔ بلکہ ہمارے ساتھ۔"

عورت بذات خود ایک ہنگامہ ہے۔ صدیوں سے عورت ہنگامہ برپا کرتی رہی۔ لیکن یہ کیسے ہو گیا کہ کوئی عورت کے ساتھ ہنگامہ کرے۔

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیسے؟"

"ارے جناب، آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب عورت دیوی ہوتی تھی۔۔ وہ وقت چلا گیا جب شریف آدمی عورت سے کہتا تھا "Ladies First" لیکن اب بس ہو یا سنیما ہال، اسپتال ہو یا نمائش گاہ، ہر جگہ عورت کو قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے اور اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

میں سنجیدہ ہو گیا، نہ جانے کیوں میں ایسے موقعوں پر سنجیدہ ہو جاتا ہوں اور یہ سنجیدگی پراسرار بن جاتی ہے۔ لیکن میں اس کے حصار میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ میں نے کہا۔

"ہاں زمانہ واقعی بدل گیا ہے۔ تب عورت چار دیواری میں رہتی تھی۔ دفتر، ہوٹل، سنیما کی زینت نہ تھی۔ لیکن اب عورت بدلی، مرد بدلا، اصول بدلے۔"

وہ دونوں عورتیں میری میز کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ مگر چہرے پردوں میں بند تھے۔

بند چہرے الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔

اور تصویر نامکمل رہ جاتی ہے۔

ان میں سے ایک نے کہا۔

"کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے، اس لیے ہمیں پناہ لینے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ بھلا ہو آپ کا، آپ کی شرافت کا، آپ جیسے ہی لوگوں سے دنیا میں مروت، شرافت اور انسانیت باقی ہے۔"

یہ سب سن کر شاید کوئی بھی احساس برتری میں مبتلا ہو جاتا ہوگا اور خود کو ایک عام

نسان سے بالاتر سمجھنے لگتا ہوگا۔ ایک دیوتا!

لیکن میں دیوتا نہیں بننا چاہتا!!

انہوں نے مجھے دھندلکوں سے نکالا۔

''ڈاکخانہ ہمارے لیے پناہ گاہ بن گیا۔ اس پناہ گاہ میں کچھ کا[illegible] جائے۔ کچھ روپئے اپنے Saving Account میں جمع کر دیتی ہوں۔ یہ لیجیے پاس [illegible]''

دوسری نے کہا۔

''میری پاس بک بھی لیجیے۔''

راشدہ!

فاطمہ!!

میں نے ہنستے ہوئے کہا!

''یوں کہیے آپ پیسے جمع کرانے آئی تھیں۔''

''نہیں پوسٹ ماسٹر صاحب'' راشدہ نے کہا۔ ''یقین کیجیے ہمارا تعاقب ہو رہا ہے اور شاید وہ یہاں بھی آئے۔''

سیاہ برقعے سے کچھ زلفیں باہر آ گئی تھیں۔

میں نامکمل تصویروں کو پسند نہیں کرتا۔

جب میں کسی مسئلے پر زیادہ سوچتا ہوں تو اپنے خاندانی حکیم کی نصیحت یاد آتی ہے۔

''دماغ پر زیادہ زور نہیں ڈالنا چاہیے ورنہ پھٹ جائے گا۔''

میں نے اس انتشار سے چھٹکارا پانے کے لیے فاطمہ سے کہا۔

''کیا میں آپ کے ہاتھ میں موجود ان کتابوں کو دیکھ سکتا ہوں۔''

اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

''لیجیے۔''

تین کتابیں تھیں۔ پہلی کتاب دیوان غالب۔ میں نے ورق گردانی کی۔

''غالب آپ کا پسندیدہ شاعر ہے۔''

''پسند کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ چند دنوں سے اخبار، ریڈیو، رسالوں میں غالب کا ذکر پایا تو سوچا کہ اس قیامت برپا کرنے والے کی کتاب کو بھی دیکھ لیں۔''

عجیب دلیل ہے، عجیب انداز ہے۔

کچھ بھی ہو اسے اپنی انفرادیت کا شدید احساس تھا۔ لیکن ایسی انفرادیت کبھی کبھی بوجھ بن جاتی ہے۔

تکلیف دہ بوجھ......

اس نے پھر سوال کیا۔

''لیکن تمہارا پسندیدہ شاعر کوئی تو ہوگا؟''

''ہاں ہے۔''

''کون؟''

''عورت۔''

''کیا مطلب۔''

''وہ عورت جس نے دنیا کی شاعری کو جنم دیا۔ دنیا کو جنم دیا۔ میں اس کو بڑی شاعرہ سمجھتی ہوں۔''

''او۔''

''اس لیے میں خود کو بہت بڑی شاعرہ سمجھتی ہوں۔''

شاید وہ احساس کا توازن کھو بیٹھی تھی۔

میں نے راشدہ سے پوچھا۔

''یہ تمہاری کون لگتی ہیں؟''

''میری سہیلی ہے۔''

اچانک مجھے یاد آیا۔

''وہ تعاقب کرنے والا کہاں گیا ہوگا؟''

''یہاں تو نہیں آیا۔''

"لیکن کون تھا وہ۔"

"وہ میرا ہونے والا خاوند تھا۔"

میں پردے میں چھپے ہوئے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کے تاثرات کے درمیان پر سیاہ موٹا برقعہ حائل تھا۔

میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ جان کر بھی تعاقب کرتا رہا کہ تم اس کی ہونے والی بیوی ہو اور لیکن اس کے پاس تم چاروں پہر ہوگی۔"

"لیکن پوسٹ ماسٹر صاحب، وہ ہونے والی بیوی کا تعاقب نہیں کر رہے تھے۔"

"تو....."

"وہ میری سہیلی فاطمہ کا تعاقب کر رہے تھے جو ان کی محبوبہ ہے۔"

میری زبان نے کام کرنا بند کر دیا۔ میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

"لیکن یہ سب......"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" راشدہ نے کہا "یہ ضروری نہیں کہ جو بیوی ہو وہ محبوبہ ہو اور جو محبوبہ ہو وہ بیوی ہو، میں تو خود فاطمہ کے ہونے والے خاوند کی محبوبہ ہوں۔"

"اور اخلاق۔" میں چونک پڑا۔

فاطمہ کہہ اٹھی۔

"آپ لوگ دقیانوسی خیالات سے اخلاق کا دائرہ تنگ کرتے ہیں اخلاق کا دائرہ تنگ مت کیجیے۔"

میں تقریباً اب چیخ پڑا۔

"پھر اس تعاقب پر گھبرا کیوں گئیں۔"

راشدہ نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

"کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ایک مرد ایک ساتھ بیوی اور محبوبہ کو دیکھ لے۔ کیونکہ شاید پھر وہ......"

پاس بک تیار ہوگئی۔

فاطمہ اور راشدہ چلی گئیں۔

کیا کبھی ان سے دوبارہ ملاقات ہوگی!!

میں ان کو کیسے پہچانوں گا۔ ان کے چہرے تو برقعوں میں قید تھے۔

لیکن میں ایسی عورتوں کو جانتا ہوں۔

لیکن نامکمل تصویروں کو جانتا ہوں۔

مالک مکان کے نام

میں سیٹھ بدھورام جی کے انوکھے Import اور Export دفتر میں ۱۰ ہزار روپے کا جو مہینے میں مجھے تین قسطوں میں ملتا ہے۔ چپراسی سے لے کر منیجر تک سب کچھ ہوں۔ بدھورام کا نام صرف بدھورام تھا۔ لیکن پیسے بنانے میں وہ ہرگز بدھورام نہیں تھا۔ ایک دن اس کے انوکھے دفتر کے سامنے تین آدمی انتظار کر رہے تھے۔ میں ان تینوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک تو سیٹھ بدھورام کے کالے پیسے کے بنائے مکان کا کرایہ دار تھا۔ دوسرا شہر کا نامی غنڈہ مٹھورام۔ تیسرا آدمی.......یہ کون..... ہاں..... یاد آیا یہ سیٹھ صاحب کی اکلوتی لیکن دبلی پتلی بیٹی نرملا کے ساتھ مجھے کئی دفعہ ملے تھے۔ میں دفتر کا تالا کھولنے لگا تو مٹھورام نے نہایت انکساری مگر دھمکی کی مٹھاس لیے ہوئے کہا۔

"یہ خط لیجیے اور اپنے سیٹھ کو دے دیجیے۔"

یہ کہتے ہی وہ چلے گئے۔ پھر جناب کرایہ دار انوکھے وضع کے ساتھ کہنے لگے۔

"اے مسٹر یہ خط اپنے مالک کو دینا۔"

وہ بھی چلے گئے اور پھر میں قفل کھولنے لگا۔ لیکن نوجوان کے پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اس کی گڑگڑاہٹ نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کیا۔ "آپ کو کیا تکلیف ہے۔"

"تکلیف" اس نے رعب جماتے ہوئے کہا "تکلیف نہیں خط ہے۔"

خط دے کر جدید نوجوان Rock n roll کرتے ہوئے چلا گیا۔ میں نے دفتر کا تالا کھولا۔ کرسی پر بیٹھا۔ میز پر تین خط تھے۔ نہ جانے میرا دل ان خطوط کو دیکھ کر کیوں مچل اٹھا۔ یوں تو کسی کا خط پڑھنا اخلاق کے خلاف ہے لیکن اخلاق کے اصولوں پر آج کل عمل ہی کون کرتا

ہے۔ پہلا خط جو میرے ہاتھ میں آگیا وہ جناب کرایہ دار کا تھا۔ مالک مکان کے نام۔

''میں حضور مالک مکان آپ کو سلام نہیں کروں گا کیونکہ آپ کے مکان کے کرایہ اور اس مکان کے آپ [illegible] کے مالک ہونے نے آدھی روٹی کھانے پر مجبور کیا۔ میری تنخواہ صرف ۱۰ ہزار روپے ہے اور اس [illegible] آپ کے مکان کے تین کمروں کے لیے پانچ ہزار کرایہ میری جیب سے آپ کے پیٹ [illegible] ں جیب سے تجوری میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح آپ میری زندگی کی آدھی کمائی کو مکان [illegible] کمروں پر لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس سراسر ظلم کے خلاف ''دھرنا'' دیا جائے گا یا آپ [illegible] کہ مجھے اس بے جا دولت سے اپنا گھر نہیں بھرنا ہے۔

آپ کی بیٹی نرملا کا دل آپ کی طرح ڈائمنڈ کا نہیں گوشت کا بنا ہوا ہے۔ وہ میری حالت دیکھ کر کہتی ہے..... ''چاچا جی میرے بس میں ہوتا تو میں آپ سے کوئی کرایہ نہ لیتی۔''

حضور سیٹھ صاحب اگر آپ نے اپنے فیصلہ جات پر نظر ثانی نہ کی۔ مہنگائی کے اس زمانے میں کرایہ کم نہ کیا تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ کس طرح آپ کی نرم دل بیٹی نرملا آپ کے مکان کی مالکن بن جائے۔

سمجھدار کے لیے اشارہ کافی ہے۔''

بے ایمان مالک کا ایمان دار کرایہ دار...... ٹھگ لال

اب دوسرا خط جو میرے ہاتھ میں تھا وہ مٹھو رام غنڈے کا مالک مکان کے نام تھا۔

''ہم غنڈوں کی دنیا میں سلام کے بدلے چھری دکھائی جاتی ہے۔ لیکن اس سلام سے پہلے میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے ٹھگ لعل کرایہ دار کو اس مکان سے نو دو گیارہ کیجیے۔ اس ازلی کمبخت کے پاس سونے کا ایک زیور بھی نہیں۔ پھٹے ہوئے لباس کے علاوہ اس کے پاس پھٹی ہوئی مفلسی ہے، میں ایسی جگہ ڈاکہ ڈالنا توہین سمجھتا ہوں۔ مجھے تو چاہیے کالے اور سفید روپیوں سے بنا ہوا بدھو رام..... اور..... پھر تمہارے اس کرایہ کے مکان پر ڈاکہ ڈالنا اتنا آسان ہے جتنا جیب میں ہاتھ ڈالنا۔ تمہاری وہ بیٹی ہے نا۔ مجھے چاچا کہتی ہے۔ ایک دن کہنے لگی۔ ''چاچا جی نہ جانے میرا باپ کیوں دن بہ دن کنجوس ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا خاصا مکان کرائے پر اٹھا رکھا ہے اور ہم اس گندے مکان میں رہتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو ابھی اس مکان میں چلی جاتی۔

بدھورام جی اپنی راہ تبدیل کیجیے اور اس مکان میں آجایئے۔ ورنہ مجھے نرملا دیوی کو اس مکان میں لانا پڑے گا۔ پھر مجھے افسوس ہوگا کہ ہمارا 'سلام' تمہارے مکان کے بدلے کسی گلی کوچے میں ہوگا۔"

تمہارے مکان کا دوست لیکن تمہارا دشمن... بدھورام

تیسرا خط چونی لال موتی کا تھا۔

"عاشقوں کی دنیا میں سلام نہیں کیا جاتا۔ آنکھیں بچھائی جاتی ہیں اور ان آنکھوں سے اپنا درد دل سنایا جاتا ہے۔ لیکن میں تمہیں اپنا درد دل آنکھوں سے نہیں اپنے قلم سے سناؤں گا۔ میں عاشق ہوں تمہاری بیٹی کا۔ وارا ہوں اس کی ہر ادا پر۔ لیکن اس عشق کے درمیان جب تمہارے مکان کا ذکر آتا ہے تو عشق بے مزہ ہو جاتا ہے۔ تمہاری بیٹی اکثر تمہارے کرائے کے مکان کا تذکرہ کرتی ہے۔ تب اس عاشق کے سینے پر تیر چل جاتا ہے۔ میں مفلس ہوں لیکن دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے۔

کاش میں امیر ہوتا، تیرے گھر کے سامنے گھر بناتا۔" لیکن مجھ جیسے غریب عاشق کے لیے یہ جوئے شیر لانے کے برابر ہے اس لیے آپ سے التجا ہے..... کہ آپ کرائے کے مکان میں خود چلے جایئے تاکہ عشق کی دنیا میں پھر کبھی اس کرائے کے مکان کا ذکر نہ آئے اور پھر جو آپ کی بیٹی کا اور میرا چند دنوں کا ساتھ ہے وہ بغیر کسی کھٹکے سے گذرے کیونکہ میں جانتا ہوں مجھ جیسا غریب عاشق آپ کا داماد نہیں بن سکتا۔ اگر آپ نے میرے مشورے پر عمل نہ کیا تو مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ میں کس طرح نرملا اور نرملا کے کرائے کے مکان کو حاصل کروں۔"

عاشق...... چونی لال موتی

تین خط ختم ہی ہوئے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے شور اٹھایا۔

میں نے کہا..... "ہیلو۔"

"آپ کو یہ خبر دی جاتی ہے کہ آپ کا مالک ابھی ابھی کار کے حادثے میں مر گیا"....

"ایں" میں چونک پڑا۔

سامنے تین خط تھے..... نرملا دیوی..... اور تین خط۔

پردہ

وہ مجھے اس انداز سے ملی کہ جیسے پہلے کبھی ملی ہی نہ ہو۔ اکھڑی اکھڑی، اجنبی اجنبی۔ تھوڑی دیر میں بھی اس حیرت میں مبتلا رہا کہ شاید میں نے اس کو خواب میں دیکھا ہوگا۔ لیکن میں نے تو اس کے آٹو گراف بک پر غالب کا یہ شعر لکھا تھا۔

بلائے جاں ہے غالب ان کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

وہ دن تو میری زندگی کا حسین ترین دن تھا۔ میں اس یادگار مشاعرے پر ایسے چھا گیا کہ تالیوں اور ''واہ.....واہ'' کی آوازوں سے سامعین نے ہال سر پر اٹھا لیا۔ جب شعر و شاعری کی وہ عظیم مجلس ختم ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو آٹو گراف لینے والوں کے نرغے میں پایا اور اسی نرغے میں مجھے یہ لڑکی ملی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس لڑکی کی شکل وصورت نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ لیکن مجھے اس تک رسائی حاصل نہ ہوئی۔ اور نہ ہی پھر کبھی اس کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اس لیے محبت کا سلسلہ بھی شروع نہ ہوا۔

اب اس سے دوسری ملاقات میرے دوست کرامت علی کی شادی پر ہوئی۔ کرامت نے مجھے ملاتے ہوئے کہا۔

''ذکیہ بہن یہ میرے دوست انور احمد انور ہیں۔ بڑے اچھے شاعر۔''

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''نام تو سنا تھا۔ لیکن اب تک دیکھا نہیں تھا۔''

لیکن میں ذکیہ کو پہلی نظر میں پہچان گیا۔ میں نے کہا۔

''میں تو آپ کو.....''

ذکیہ نے بیچ میں بولا—

'' پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید کسی اور لڑکی کے ساتھ آپ مجھے گڈمڈ کر رہے ہیں۔''

اس کی یہ ادا میرے لیے معمہ بن گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس وہم میں مبتلا ہوا کہ کہیں اس لڑکی کو بھول جانے کی بیماری نہ ہو۔ پھر بھی میں ذکیہ کو چاہتا تھا شاید اس کو بھی میری آنکھوں میں وہ چمک نظر آئی۔ اس لیے شادی کے ہنگامے میں جب وہ میرے پاس سے گزرتی تو اپنی نگاہوں کو نیچے کر کے چلی جاتی۔ اس طرح اس بار بھی محبت کا سلسلہ جاری نہ ہوا کیونکہ کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ ذکیہ کی خاموشی نے میرے سارے حوصلے پست کر دیے۔

زندگی ایک الجھن ہے۔ آج کل زندگی میں غم جاناں سے زیادہ غم دوراں مار رہا ہے۔ میں اپنے شہر سے بہت مدت تک بے خبر رہا۔ اس دوران میرے دوست کرامت علی کی چچیری بہن بھی مر گئی۔ میں صرف اس کو تعزیتی پیغام بھیج سکا۔ نوکری والے آدمی کو نوکری کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ پھر میرا تبادلہ واپس اپنے شہر ہوا۔ ان ہی دنوں میرے والدین کو میری شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ میں گھر والی لانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں آزاد طبیعت کا آدمی اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ والدہ کی زبان پر ہر دن لڑکیوں کا تذکرہ رہتا اور کسی کسی لڑکی کا فوٹو بھی مجھے دکھاتیں۔ لیکن میں بہانہ بنا کے بات کو ٹال دیتا۔ کبھی کہتا۔

''امی اس کی ناک چھوٹی ہے۔''

''اس کا سب کچھ تو ٹھیک لیکن اس کی آنکھیں بلی جیسی ہیں۔''

''اس کے بالوں سے لگتا ہے کہ یہ زبردست فیشن پرست ہے۔''

اور پھر ایک دن خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹ گیا۔ جب میرے ہاتھ میں ذکیہ کی تصویر آئی۔ امی نے کہا۔

''بیٹے لاکھوں میں ایک لڑکی ہے۔ چراغ لے کے ڈھونڈنے نکلو تو بھی ایسی لڑکی نہیں ملے گی۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''امی جب تمہیں پسند ہے تو مجھے بھی یہ لڑکی پسند ہے۔''

والدہ میرا جواب پا کے بہت مسرور ہوئیں اور دعا دینے لگیں اور میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگا۔ جس کو چاہا اس کو پایا۔ خدا بھی کبھی کبھی کسی معاملے میں ڈرامائی انداز اختیار کرتا ہے۔

ذکیہ کے ساتھ میری شادی طے ہوئی۔ شدت سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب ایک بار اپنے حجرۂ عروسی کے کمرے میں ذکیہ سے ملوں اور اس سے کہوں گا۔

''اب مجھے پہچانتی ہو۔ میں وہی ہوں جو تم کو سب سے پہلے مشاعرے میں ملا اور تمہاری پہلی نظر سے گھائل ہوا۔''

[illegible] نے میں شادی کے دن کیا کیا سوچتا رہا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا۔ جب میں دولہا بن کر گھوڑ۔۔ [illegible] پر گیا اور ڈولی میں ذکیہ کو دلہن بنا کر لایا۔ اس دوران انتظار کا ایک ایک لمحہ قیامت خیز تھا۔

[illegible] عروسی کے کمرے میں اپنے ماتھے کے پسینے کو رومال میں جذب کر رہا تھا۔ ذکیہ سرخ ساڑی [illegible] [illegible] گٹھری بنی ہوئی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کا گھونگھٹ اٹھایا اور کہا۔

''[illegible] تی ہو مجھے.....آ......جواب دو۔''

میرے بے حد اصرار پر اس نے نرم آواز میں جواب دیا۔

''بھائی کرامت علی کی شادی پر دیکھا۔''

''غلط'' میں نے کہا۔ ''تم نے مجھے اس سے پہلے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا۔''

اس نے جواب دیا۔

''لیکن میں آج تک مشاعرے میں نہیں گئی۔''

میں پھر الجھن میں پڑ گیا۔ لیکن ایسی قیمتی سہاگ رات کو اس الجھن کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سہاگ رات چلی گئی۔ صبح آ گئی۔ ذکیہ نے باتھ روم جانے سے پہلے اپنے سوٹ کیس سے کچھ کپڑے نکالے۔ میری نظر سوٹ کیس کے اندر چلی گئی۔ اس میں ایک ڈائری تھی۔ اس ڈائری کی حقیقت جاننے کے لیے مجھ سے ایک غیر اخلاقی حرکت سرزد ہوئی۔

ڈائری کے صفحات دیکھتے ہوئے مجھے ایک صفحہ پر اپنا دستخط اور میرے ہاتھ سے غالب کا لکھا ہوا شعر ملا۔ اس شعر کے نیچے لکھا تھا۔

انور میرے خوابوں کا راجہ ہے۔

شاہدہ

میں نے سوٹ کیس میں ڈائری واپس رکھ دی۔ ایک بار میں پھر الجھن میں گرفتار ہو گیا۔

ذکیہ کے باتھ روم سے واپس آتے ہی میں نے اس سے کہا۔

''ذکیہ کیا تم ڈائری رکھتی ہو؟''

''میں تو ڈائری نہیں رکھتی البتہ شاہدہ رکھتی تھی۔''

''شاہدہ کون؟''

''شاہدہ میری بہن تھی۔ کرامت بھائی کی شادی سے چند دن پہلے اس کو بخار آنے لگا۔

کرامت بھائی کی شادی کے چند دنوں بعد اچانک وہ سخت بیمار ہو کر فوت ہوگئی۔''

''کیا وہ تمہاری بڑی بہن تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہ وہ میری بڑی بہن تھی نہ ہی چھوٹی۔ ہم دونوں ایک ساتھ پیدا [illegible]۔ اگر [illegible] اس کو اور مجھے اکٹھے دیکھتے تو فرق نہ کر پاتے۔ ہم دونوں ہم شکل تھے۔''

میں نے خود سے کہا۔

''تو وہ شاہدہ تھی جو مجھے مشاعرہ میں ملی تھی۔''

لیکن میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس حقیقت پر ''پردہ [illegible]

قربان گاہ

صبح تو اپنی ہواؤں میں خوش آہنگی اور زندگی کا نیا ساز لیے ہوئے آئی۔ انسان نے موت پر فتح پائی۔ زندگی کا دامن چھوڑنے والا پھر ایک بار انسانی جامے میں آ گیا۔ میری والدہ محترمہ کو Common bile duct کے ایک خطرناک آپریشن سے دوچار ہونا پڑا۔ خطرہ بھی ٹل گیا اور زندگی میں سکون بھی آ گیا۔ سب خوش تھے لیکن میرے چاچا اس انسانی زندگی کے بدلے ایک قربانی دینا چاہتے تھے۔ اس لیے ایک صبح انہوں نے مجھ سے کہا۔

''سعید ایک بکرا خرید لو۔ ذبح کراؤ اور جامع مسجد جا کر گوشت کو غریبوں میں تقسیم کرو۔''

بزرگ کا حکم تھا اور حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض۔ میں ایک ادیب ہوں جو اپنے پاس ایک حساس دل رکھتا ہے۔ ایک ایسا دل جس کے لیے ایک معمولی چوٹ بھی اٹم بم سے کم نہیں ہوتی۔

میں حکم کی تعمیل کرنے چلا۔ وہی جانی پہچانی گلیاں، وہی برے بھلے چہرے۔ ان سے تو میں پہلے سے ہی واقف ہوں۔ لیکن یہ سب کیوں مجھے اس دن اجنبی لگتے تھے..... نہ جانے کیوں...... بکرا خریدنا تھا۔ مجھے وہی لمبی سیاہ داڑھی، خوفناک آنکھوں والا موٹا اور قد دراز لنگی اور لمبا کرتا، اس کے زیب تن تھا۔ وہ بکرے فروخت کرنے والا تھا۔ میں نے ایک بکرے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''چار ہزار۔''

''چھ ہزار۔''

''اتنے اونچے دام کیوں لگاتے ہو۔''

''اونچے دام لگانے پر گاہک ہی مجبور کرتے ہیں۔''

''جو کہا سو لے لو۔ مجھے ان حیوانوں کو خریدنے میں کھینچا تانی پسند نہیں۔''

''بابو آپ کو حیوانوں کو خریدنے میں کھینچا تانی پسند نہیں ہے۔ لیکن یہاں تو انسانوں کو خریدنے اور فروخت کرنے میں کھینچا تانی کی جاتی ہے۔ پانچ ہزار دیجئے اور لے لیجئے اس بکرے کو۔''

پانچ کاغذ کے ٹکڑے اس کے عوض میں ایک روح...... ایک معصوم جان اور اس کا سب کچھ مل رہا تھا اور وہ پانچ کاغذ کے ٹکڑے بھی تو اس کو نہیں مل رہے تھے۔ یہ انسان بھی کتنا ظالم ٹھیکیدار ہے۔ طاقت کے بل پر حیوانوں پر راج کر رہا ہے۔ وہ معصوم بکرا اب قربان گاہ جا رہا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے سارا جہان اس کے ساتھ قربان گاہ جا رہا تھا۔ قصائی نے بکرے کو پرکھا۔

پورے پانچ سولوں گا۔'' پانچ کے لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے اس نے کہا ''ورنہ مجھے اس کی کھال دے دیجیے۔''

''کھال لے لو۔''

میں نے کھردری آواز میں جواب دیا۔ جیسے یہ سودا کرتے ہوئے مجھے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ لیکن یہ تو خوشی کی قربانی ہے۔ ایک زندگی پائی۔ اس کے عوض ایک زندگی تو دینی ہی ہے۔ ابھی قربان گاہ کے پرنالوں سے سرخ خون بہے گا۔ ابھی جامع مسجد کے بڑے مینار سے اذان بلند ہوگی۔ ابھی کلیسا میں گھنٹیاں بجنی شروع ہو جائیں گی یہ سب تو ابھی ہوگا۔ مینار کی اذان...... مندر کی گھنٹوں سے۔

ایک ہی آواز آرہی ہے۔

قربانی...... قربانی...... قربانی........

خدا کو قربانی چاہیے کس لیے...... کیوں...... میں نے دیکھا...... ایمان بکتا ہے۔ جان بکتی ہے۔ دو پیسے میں رام بکتا ہے..... ایک بچہ ایک ہاتھ میں رام اور دوسرے ہاتھ میں سیتا کی مورتی بیچ رہا تھا کہ بکرا فروخت کرنے والے سے ٹکرایا۔ رام ٹوٹ گیا، سیتا چکنا چور ہوئی۔

بچہ رو رہا تھا۔ میں نے بچے کو اٹھایا۔

"نیا رام چاہیے نئی سیتا چاہیے۔"

بچے نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنا رام اور اپنی سیتا چاہیے۔" بکرا بھی معصوم نگاہوں سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے بھی نئی زندگی چاہیے۔ مجھے بھی یہی زندگی چاہیے۔"

لیکن قصائی اس بے بس جانور کو بے دردی سے کھینچے جا رہا تھا۔ وہ مجھ سے التجا کر رہا تھا کہ نہیں میں نہیں جاؤں گا اس قربان گاہ میں......

تیز لمبی چھری صاف شفاف تھی......ایک نہیں......دو نہیں......درجنوں تھیں.......

ان کو دیکھ کر بکرے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا بھی دل چھلنی ہوا۔ لیکن......لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ اس کو تو قربانی پر چڑھ جانا تھا۔ اس کے گوشت و پوست جسم سے اس کی ریشم جیسی کھال الگ ہو جانی تھی...... قصائی اپنی چھری سے اس کا گلا کاٹے گا۔ قصائی اپنی چھری.......

اف...... یہ میں کہاں آ گیا۔ نہیں میں ایسا پتھر دل نہیں ہوں۔ میرے تاثرات میرے چہرے پر نمایاں تھے جس کو سمجھ کر بیٹھے ہوئے لوگ مجھے حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ قصائی نے مجھ سے کہا۔

"کیا ہوا بابو؟"

"کچھ نہیں۔"

میں نے ہوش سنبھالا۔ ابھی تک قصائی نے چھری نہ اٹھائی تھی۔ لیکن میرے ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی قصائی کے اوسان بگڑ گئے۔ بکرا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرا چہرہ اب ہشاش بشاش ہوا۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے قصائی کے بیٹے نے کہا۔

"جائے گا کہاں حرامی...... آخر دم توڑنے کے لیے اس کو قربان گاہ آنا ہی ہوگا۔"

وہ زلیخا

جب میں اپنا کٹا ہوا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر لال چوک میں کھڑا ہوا تو لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ لوگ یہ منظر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے اور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"یہ ہماری سوچ ہے یا حقیقت"

میں بھی پریشان تھا کہ مجھے اپنا سر دھڑ سے کیوں الگ کرنا پڑا۔

میں کوئی یوسف تو نہیں لیکن کسی سے کم بھی نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کر خوبصورت لڑکیاں خواب میں اپنی انگلیاں ضرور کاٹ کھاتی تھیں۔ راستوں پر ترچھی یا چوری کی نظر سے مجھے ایک بار گھور کے دیکھتی ضرور تھیں۔

یقیناً میں بھی حسن کی تاریخ کے سلسلے میں اپنی ایک تاریخ منسلک کر رہا تھا۔ وہ بھی کوئی زلیخا نہیں تھی لیکن زلیخا سے کم بھی نہیں تھی۔ بے پناہ حسن کی ملکہ، ایسا حسن ادراک کی حدوں کو پار کر دیتا ہے۔

نہ میں اس کا عاشق تھا اور نہ وہ میری محبوبہ۔ پھر بھی کیا کشش تھی کہ ہم ایک دوسرے کی جانب کھنچتے جا رہے تھے۔ لیکن بہت قریب ہو کر بھی ایک دوسری کے قریب نہ تھے۔

اسی طرح ہم ایک دوسرے کی کشش اور دلچسپیوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ کچھ دنوں کے لیے ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا۔ مجھے دوسرے شہر کی رنگینیوں میں کھو جانا پڑا جہاں یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ دن کب غروب ہوا اور رات کب ختم ہوئی۔

اس شہر میں ایک حسینہ کی اداؤں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ گرفت اس قدر

مضبوط تھی کہ محسوس ہی نہ ہوا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ وہ میرے اوسان پر اس قدر حاوی تھی کہ پیتل کی چیز بھی اگر وہ سونا کہے تو مجھے سونا لگتی تھی۔ اس قدر مدہوشی کے عالم میں میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ساری دنیا میری دشمن ہوگئی لیکن میں اپنے ارادے اور اپنے وعدے سے پیچھے نہیں ہٹا۔

اس کٹھن سفر میں ایسا پڑاؤ بھی آیا جب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جس کے بطن سے پیدا ہوا اسے چھوڑ دوں یا مدہوشی کے سرور میں ڈوبا رہوں۔

میں نے اس سے کہا۔

''اتنا بھی نہ کھینچ کہ میں ٹوٹ جاؤں۔''

اور میں ٹوٹ گیا۔

اس رات بہت تیز بارش ہوئی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس رات سارا شہر ڈوب گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ مایوس...... بے بس......تارے گننے کے لیے لیکن اس رات تارے بھی نہ نکلے۔

مایوسی کا یہ عالم بہت دنوں تک رہا۔ بہت دنوں بعد میں اپنے شہر واپس لوٹا۔ یہاں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہر جانب ہریالی تھی۔ مجھے میرے شہر نے گلے لگایا۔ یوں لگا صدیوں بعد اس جنت میں واپس آیا ہوں۔

زلیخا وہیں تھی جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔

وہ آج بھی اچھوئے حسن کی شہزادی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''کیا ملا تمہیں اجنبی شہر کی خاک چھان کر۔''

مجھے یوں لگا جیسے مجھ سے کہہ رہی ہو۔

''یوسف، زلیخا صرف یوسف کے لیے بنی ہے اور یوسف زلیخا کے لیے۔''

اس سوچ نے مجھے مایوسی کی دنیا سے نکال کر ایک بار پھر محبت کی دنیا میں لا کھڑا کیا۔

میں زلیخا کے قریب ہوتا گیا اور اپنی دنیا سجانے لگا۔ مجھ سے کہا گیا۔

تمہارا نکاح زلیخا کے ساتھ ہوگا۔

میں نے بے چوں چراں کے حامی بھری اور دل ہی دل میں خوشی سے اچھلنے لگا۔

جب زلیخا دلہن کے لباس میں حجلۂ عروسی میں داخل ہوئی، میں بول پڑا۔

''مجھے میری دنیا مل گئی۔''

زلیخا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

''کیا ہوا زلیخا......تم خوش نہیں۔''

وہ کمرے کے ایک کونے میں دبک گئی۔ سارا ماحول ماتمی ہو گیا۔

میں ٹوٹ کے بکھر گیا۔ لیکن اب......!

بہت دنوں تک میں سوچتا رہا۔ ڈوبتا رہا......ابھرتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ جب عقل جواب دے گئی تو میں زلیخا کے پاس گیا۔

''زلیخا بول......مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''یوسف تم میرے عزیز ہو۔ لیکن جس رشتے میں ہم بندھ گئے، میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہ سب کیسے ہوا، کیوں ہوا......میں کچھ نہ سمجھ سکی۔''

''لال چوک میں جمع لوگوں کا ہجوم کیا اب بھی مجھ سے یہ سوال کرے گا کہ میں نے اپنا سرا اپنے دھڑ سے کیوں الگ کیا۔''

خواب حقیقت

اس نے کورے کاغذ پر رنگوں کی بوچھار کردی۔ پتہ نہیں اس نے ایسا کیوں کیا۔ پاس کھڑی حسینہ نے کہا۔

"رنگوں کی یہ بوچھار آنے والی خوبصورت تصویروں کی داستاں سنا رہی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے ہاتھ چوم لوں۔"

اس نے اپنے ہاتھ حسینہ کے سامنے کر دیے۔

جب وقت نے رفتار پکڑی، اس کے کورے کاغذ پر دلہن کی تصویر ابھر آئی۔ لیکن وہ اسے رنگوں سے سجا نہ سکا کیونکہ مرد تھرکنے لگے، عورتیں ناچنے لگیں۔ گانے بجانے، بینڈ باجا سب آ گیا۔ دلہن کے خوبصورت ہاتھوں میں مہندی لگی۔ اسے پالکی میں سوار کیا گیا۔ جاتے جاتے دلہن نے اس کے ماتھے کو چوما۔ یہ وہ لمحہ تھا جب اس کی آنکھیں گنگا جمنا بن گئیں۔ اس رات کے اندھیرے میں اس کا سب کچھ کھو گیا۔ وہ ننگے پاؤں پاس والے قبرستان کی جانب دوڑ پڑا۔ اس رات کے اندھیرے میں اس نے اپنی ماں سے بھی عزیز گڑیا کو سپرد خاک کیا۔

وقت نے جب کروٹ بدلی، اس کے ہاتھوں میں کھردرے پتھر آ گئے۔ ان پتھروں سے شاہکار نکل کر کلیساؤں میں سجنے لگے۔ کبھی کرشن، کبھی رام!!

اس کا برش کبھی رادھا، کبھی میرا کو کینوس پر ابھارتا۔ لیکن اس کے خوابوں اور اس کی آنکھوں میں سجی ہوئی وہ حسینہ ابھی تک کورے کاغذ پر نہ اتر سکی تھی۔ پھر وہ لمحہ آیا جب اس کا برش حسینہ کا کچھ عکس کینوس پر اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اسے گھنٹوں دیکھتا رہتا اور اپنے اردگرد

کے ماحول سے بے خبر ہو جاتا۔ کئی دنوں تک وہ اسی کیفیت میں ڈوبا رہا۔ پھر وہ عکس بولنے لگا۔

وہ چونکا۔ پہلی بار اس کو معلوم ہوا کہ عکس بھی بولتے ہیں۔

"یہ کیسے اور کب ہوا۔"

عکس بول پڑا۔

"فریب اور حقیقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

نہ جانے کیوں وہ رنگ برنگ پتھروں کو چننے لگا۔ الماس، زمرد، [illegible]
پتھروں سے سجانے لگا۔ یہ ساری کیفیت خواب کی سی کیفیت تھی۔

خواب بکھر جاتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں۔

حسینہ جو کل تک حقیقت تھی، آج پھر خواب ہو گئی۔

ایک بار پھر وہ بہت رویا۔ اپنی بنائی تصویر کو نذر آتش کر دیا۔

وقت کب اور کیسے گزرتا رہا، اسے محسوس نہ ہوا۔ وہ تصویریں بناتا رہا، تصویریں بکتی رہیں۔ اس کی آنکھوں کی بینائی بھی اب جواب دینے لگی تھی۔ نہ جانے کب اور کیسے حسینہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کون ہو تم؟"

"حسینہ"

"فریب یا حقیقت"

حسینہ نے آسمان کی جانب دیکھا اور بولی۔

"بزرگ میرے ہاتھ میں ہاتھ دو۔"

اس کی آنکھوں کے آنسو شل ہو گئے۔

"کیا حقیقت اتنی تلخ ہوتی ہے۔"

پھر اس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں بند کر لیں، کسی نئے خواب حقیقت کے لیے۔

''خواب حقیقت''، وحشی سعید کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے۔ ان میں جو افسانے شامل ہیں وہ ایک خاص نوعیت کے حامل ہیں۔ یعنی کہ علامتی نوعیت کے ہیں۔ ان کے علامتی افسانے ان افسانوں کے سلسلے کی اگلی گڑی معلوم ہوتے ہیں جو ایک زمانے میں بلراج مینرا، سریندر پرکاش، انور سجاد اور دیگر علامتی افسانہ نگاروں نیز بلراج کومل تک کا خاصہ تھے۔ درمیان میں ایک وقت ایسا ضرور آیا کہ تجرید کے نام پر ایسے افسانے وجود میں آئے جن کا افسانوں کی علامتی روایت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جن سے افسانوں کی علامتی روایت پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ وحشی سعید کے افسانے آج کے عہد میں افسانے کی مثبت علامتی روایت از سرنو دریافت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جاوید انور

Tahreek-e-Adab
Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata
Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 (U.P.) INDIA
Cell: 0091 - 993-595-7330
e-mail: jaweanwar@gmail.com